جدید سندھی ادب
اردو تراجم

جدید سندھی ادب

(اُردو تراجم)

آفاق صدیقی

پاکستان فاؤنڈیشن
۶۵ - شاہراہ قائدِ اعظم، لاہور

تاریخ اشاعت : جون ۱۹۷۷ء

کتابت : قاضی مختار احمد

قیمت : ۶ روپے

ریاض انور نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر پاکستان فاؤنڈیشن
۶۵۔ شاہراہِ قائد اعظم لاہور سے شائع کی

ترتیب

— مقالے —

حرفِ آغاز	جسٹس سردار عبدالجبار خان	۵
جدید ادب کی اہمیت	شیخ ایاز	۷
سندھی افسانے پر ایک نظر	ڈاکٹر غلام نبی الانا	۹
جدید سندھی شاعری	ڈاکٹر تنویر عباسی	۱۵
نئی لوک کلاسیکل شاعری	امداد حسینی	۲۲

— افسانے —

اپنوں سے بچھڑا پنچھی	شیخ عبدالرزاق راز	۲۶
طغیانی	غلام ربانی	۳۱
پیرانی	جمال ابڑو	۳۷
بلو دادا	ایاز قادری	۴۰
خُداداد (خاکہ)	رشید بھٹی	۴۴
تنویر صبح	نسیم کھرل	۵۱
خونی رات	امر جلیل	۵۷
آنسو — اور — تبسم	زیڈ۔ اے۔ شیخ	۷۲

— نظمیں اور غزلیں —

سامراجیوں سے.....	شیخ ایاز	۸۷
رقص شرر	شیخ ایاز	۸۹
حیدر آباد	شیخ ایاز	۹۰
غزلیں	شیخ ایاز	۹۱ تا ۹۵

عنوان	مصنف	صفحہ
مشعل امید (ترجمہ آفاق صدیقی)	شیخ ایاز	۹۶
مفلس کا لہو	"	۹۷
انتباہ	تنویر عباسی	۹۹
جوت جلتی رہے	"	۱۰۰
ہم خود رہبر	"	۱۰۱
ویت نام لے ویت نام	نیاز ہمایونی	۱۰۲
غزل	امداد حسینی	۱۰۳
میرا دشمن	"	۱۰۴
کن فیکون	سحر امداد	۱۰۵
قصور	"	۱۰۶
ایک ادھوری پوری کہانی	"	۱۰۷
کینسر	"	۱۰۷
قفس	بردہ سندھی	۱۰۸
روایت	تاج بلوچ	۱۰۹
غزلیں	راز بلڑائی ، علی محمد مجروح	۱۱۰
اندھی لہر	نعیم دریشانی	۱۱۱
نیا سال	بشیر موریانی	۱۱۱
آزادی	شیخ محمد ابراہیم خلیق	۱۱۲
اوساطھی	روشن مغل	۱۱۳
ترغیب	سلیم گاڑھوی	۱۱۴

— ڈرامہ —

عنوان	مصنف	صفحہ
چوراہا (ڈرامہ)	مراد علی مرزا	۱۱۵

حرفِ آغاز

زبانوں سے عدم واقفیت اجنبیت کی دیواریں کھڑی کر دیتی ہے اور افہام و تفہیم کے سارے راستے مسدود کر دیتی ہے۔ جس ملک میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہوں وہاں ایک مشترکہ زبان میں ان زبانوں کے ادب کا ترجمہ انتہائی ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ایک خطے کے لوگ دوسرے خطوں کے بسنے والوں کی آرزوؤں۔ تمناؤں اور خوابوں سے آشنا ہو سکیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ادب ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی عمل سے ہی قومی سطح پر ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں قومی سطح پر اس ضرورت کو پوری طرح نظرانداز کیا گیا ہے اور نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی المناک صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہم اپنے انتہائی محدود وسائل کے باوجود اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جدید سندھی ادب کے انتخاب کا اردو ترجمہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اگر حالات سازگار رہے تو مستقبل قریب میں ہم جدید پشتو۔ سرائیکی۔ بلوچی اور پنجابی ادب کے تراجم شائع کریں گے۔ شاید اس طرح زبانوں کا بُعد دور ہو سکے۔

اس کتاب میں شامل انتخاب پوری احتیاط سے کیا گیا ہے تاکہ تمام نکتہ ہائے نظر کو نمائندگی مل سکے۔ اور جدید سندھی ادب کا ایک مکمل نقش آپ کی نظروں کے سامنے آ سکے۔ اس انتخاب میں تنقیدی مضامین نظمیں۔ غزلیں۔ افسانے اور ایک ڈرامہ شامل ہے۔ جو بڑی حد تک جدید سندھی ادب کی عکاسی کرتا ہے۔ سندھی ادب میں منفی رجحانات رکھنے والوں کا ایک مختصر گروہ بھی شامل ہے۔ جن کی نگارشات میں نفرت اور تلخی گھلی ہوتی ہے۔ ہمارے انتظامی بورڈ کے فیصلے کے مطابق ان تحریروں کو اس انتخاب میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ ہم نفرتوں کے سوداگر نہیں اس مجموعے میں گذشتہ دس برس کے ادب کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔ شروع میں جدید سندھی ادب کی مختلف اصناف کے بارے میں شیخ ایاز۔ ڈاکٹر غلام علی الانا۔ ڈاکٹر تنویر عباسی اور امداد حسینی کے تعارفی مضامین شامل

ہیں تاکہ آپ سندھی ادب کے جدید رجحانات سے آشنا ہو سکیں۔ شیخ ایاز کے مضمون کو چھوڑ کر جس میں
صرف نظریاتی پہلو اجاگر کیا گیا ہے۔ باقی مضامین میں ادیبوں اور ان کی تحریروں کے حوالے سے
ادبی تخلیقات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے جو یقیناً سندھی ادب کو سمجھنے کے لئے انتہائی مفید ثابت
ہوں گے۔ شعری اور افسانوی حصے میں تمام نئے اور پرانے لکھنے والوں کی تحریریں شامل ہیں۔ ان
کے معیار کے بارے میں میں کچھ نہیں کہوں گا۔ آپ خود پڑھ کر اپنی رائے قائم کریں۔ ہمارا فرض صر
ان تحریروں سے آپ کو آشنا کرانا ہے جو اس سے قبل آپ کی نظروں سے اوجھل تھیں مجھے
یقین ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت سے سندھی ادیبوں کے بارے میں غلط فہمیوں کی جو دھند
دانستہ پھیلائی گئی تھی وہ اب چھٹ جائے گی۔ دعا کریں کہ ہم یہ سلسلہ جاری رکھ سکیں۔

میں آخر میں اگر اس مجموعے کے مترجم جناب آفاق صدیقی کا شکریہ ادا نہ کروں تو اپنے فرض
میں کوتاہی کروں گا۔ آفاق صدیقی نے بڑی محنت سے اس مشکل کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے
ان کے دل میں ادب کی سچی لگن ہے اور وہ اس لگن سے پھوٹنے والی روشنی کو پھیلانے میں کبھی
بخل سے کام نہیں لیتے۔

جسٹس سردار عبدالجبار خان
چیئرمین پاکستان فاؤنڈیشن

شیخ ایاز

جدید ادب کی اہمیت

دنیا میں نہ فقط آجکل بلکہ ہمیشہ سے ہی نئے اور پرانے کے درمیان اَن بَن رہی ہے۔ میں یہ فخر کی بات سمجھتا ہوں کہ اس خیالی یا حقیقی کشاکش میں میں نے قدامت پرستی اور رجعت پسندی کے خلاف جدید فکر کی حمایت کی ہے۔ اس حیثیت میں دیکھا گیا ہے کہ میرے ساتھ سندھ کی نئی اُمنگ نئی فکر اور اس کے حامیوں کی کافی مخالفت کی جاتی ہے۔

قدیم کیا ہے اور جدید کیا؟ قدیم کیوں ہے اور جدید کیوں؟ ان باتوں کا صحیح شعور و ادراک وسیع مطالعے اور گہری فکر سے ملتا ہے۔ قدامت اور جدت میں قابلِ قبول کیا ہے اور رد کرنے کے قابل کیا ہے اس کی پرکھ کے لئے نظر کی گہرائی اور دل کی وسعت درکار ہے۔ یہ ہر ایک کو نصیب نہیں۔

ادب میں جدید و قدیم کا قصہ کم نظری کی دلیل بھی ہے اور بالغ نظری کا ثبوت بھی۔ کم نظری کی دلیل اس سبب سے کہ جدید سے جدید ترین شاعر و ادیب بھی اپنے ماضی سے بالکل منحرف نہیں ہو سکتے۔ بالغ نظری کا ثبوت یوں کہ ہر سچا فن کار کسی کے نقشِ قدم پہ چلنے سے گریز کرتا ہے وہ اپنی منزل اور اپنی راہ خود ہی متعین کرتا ہے۔ ازرا پاونڈ کی ایک عجیب و غریب نظم جو اس نے امریکہ کے بہترین شاعر والٹ وٹمن کے بارے میں لکھی ہے۔ ایک منفرد اور صاحبِ طرز شاعر کی نفسیات کا صحیح جائزہ ہے۔

I make a pact with you, Walt Whitman!
I have detested you long enough,
I come to you as a grown child,
Who has had a pig-headed father.
I am old enough now to make friends,
It was you that broke the new wood,
Now it is a time for carving:
We have one sap and one root,
Let there be commerce between us.

یہی ایک منفرد فن کار کا ذہنی بلوغت پر پہنچ کر ردِ عمل ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا بغاوت سے ہوتی ہے۔

ماضی کے ہر نقش کہن سے عداوت اس کے فنی ارتقا میں معاون ثابت ہوتی ہے لیکن آخر کار وہ اپنی منزل پر پہنچ کر پیچھے کے وہی سنگ میل دیکھتا ہے جو اگر موجود نہ ہوتے تو منزل تک اس کی رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتی۔

ہر فن کار اپنی وسیع کائنات کا موجد ہے۔ وہ کسی بھی دوسرے فن کار کی حد بندی کو اگر حقارت سے نہیں تو شک کی نظر سے ضرور دیکھتا ہے۔

میں نے طالب علمی کے زمانے میں غالب کا ایک غیر معروف شعر پڑھا تھا جس کو میں آج تک نہ بھول سکا۔

کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد　　　سنگ سے سر مار کر پیدا نہ ہووے آشنا

فن واقعی وہ شیریں ہے جس کے انگنت رنگ روپ ہیں۔ فن کار کی روح ان میں صد ہا رنگینیوں کی روح تلاش کرتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ وہ ان کی ایک ہی مانوس صورت سے مطمئن ہو جائے شاہ لطیف ہوں، سچل سرمست ہوں، سامی ہوں یا کوئی اور ہر ایک نے اپنی اپنی 'شیریں' میں صد ہا رنگینیاں تلاش کیں۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ہر ایک کی 'شیریں' مانوس صورت اختیار کرتی گئی اور نئے فنکار کی بیقرار روح نے اس کو مسترد کر کے اپنی 'شیریں' آپ تلاش کی۔

یہ درست ہے کہ ماحول فنکار کو متاثر کرتا ہے مگر باغی فنکار کبھی بھی ماحول کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنا ماحول آپ پیدا کرتا ہے۔ شعر و ادب یا کسی بھی دوسرے فن لطیف میں ماحول سے مصلحت آمیزی عظیم ترین گناہ ہے۔ فن، حسن، محبت اور سچائی کا ان تھک اور ثابت قدم پاسباں ہے۔ یہ نظریہ آج بھی اتنا ہی سچا ہے جتنا شاہ لطیف اور سچل سرمست کے وقت میں تھا۔ آج کے ماحول اور ادب کا کوئی خاص جائزہ لینے کی بجائے میں شاہ لطیف کے شہرکار ابیات سے ایک مصرع پیش کرتا ہوں۔

" آسڻ جن اَريچ تن جي ڏهجو وهان ٻيو " — سانپوں کے متعلق شاہ بھٹائی کہتے ہیں کہ جن سانپوں کا آسن (ٹھکانا) بنا ریچ (ریت والی زمین میں ہوتا ہے ان کے زہر کا رنگ بھی دوسرا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر غلام علی الانا

سندھی افسانے پر ایک نظر

سندھی ادب میں افسانہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ دوسرے ملکوں کی طرح یہاں بھی اس کی سج دھج بدلتی رہی ہے اور یہ وقت اور زندگی کے تقاضوں کے مطابق ترقی کرتا رہا ہے انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں سندھی ادب کی ترقی کے لئے بنیادی کوششیں کیں اور اُن کوششوں کے نتیجے میں سندھی نثر پہ زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ سندھی میں کئی نثری کتابوں کے ترجمے کئے گئے جن میں "ایسپ کی کہانیوں" کو اس لحاظ سے بیحد اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے سندھی ادب میں افسانہ نگاری کی بنیاد فراہم کی۔ اس دور میں جو پہلی سندھی کہانی مطبوعہ شکل میں سامنے آئی وہ "رائے ڈیاچ کی کہانی" تھی۔ اس کے علاوہ کئی مذہبی اور اخلاقی کہانیاں بھی منظرِ عام پر آئیں جو عام طور پر سندھ کی عوامی کہانیوں میں شمار ہوتی ہیں

اس اولیں دور کے بعد افسانوی ادب کا تعمیری دَور شروع ہوا جس میں دیوان کوڑی مل۔ مرزا قلیچ بیگ۔ دیوان سوبھراج واسوانی اور میاں عبدالعزیز نے اصلاحی قصے لکھے۔ ان میں "دل پسند قصے"، "سبھا کا سنگھار" اور اسی قسم کے چند دوسرے مجموعے شامل ہیں۔ اس دور میں انگریزی کے علاوہ ہندوپاک کی دوسری زبانوں مثلاً اردو، ہندی، مرہٹی اور گجراتی سے ترجمے کرکے ادب کی اس صنف کو مقبولِ عام بنایا گیا۔ رفتہ رفتہ افسانے لکھنے اور پڑھنے کا شوق بڑھتا گیا۔ میلارام منگترام واسوانی، لال چند امردھنی مل اور دوسرے اہلِ قلم نے "سندر ساہتیہ"، "سندھی ساہت سوسائٹی"، "سندھو ساہت منڈل" اور ایسے ہی کئی اداروں کی بنیاد ڈالی جن سے کتنے ہی سماجی، تاریخی اور رومانی ناول اور افسانے چھپ کر سامنے آئے۔ ۱۹۱۴ء میں مرزا قلیچ بیگ نے "شریف بیگم" جیسا قابلِ قدر افسانہ لکھا جسے جدید افسانوں کا حرفِ آغاز کہا جاسکتا ہے۔

سندھی افسانے کا تیسرا دَور تحریکِ خلافت سے شروع ہوا۔ سرائی امید علی ، اور چند نشی

اس دور کے پیشرو کہلانے کے مستحق ہیں - اسی زمانے میں کئی اور اہلِ قلم افسانہ نگاری کے میدان میں داخل ہوئے پیر حسام الدین راشدی، عثمان علی انصاری، محمد صالح بھٹی، عبداللہ عبد محمد عثمان ڈیپلائی، محمد عیسیٰ نظامانی، ساقی سجاولی، نادر بیگ مرزا، لطف اللہ بدوی، امر لعل ہنگورانی، منگھارام ملکانی، شیوارام لالا، سائیں داد سولنگی اور شیخ عبدالستار کے افسانے مختلف سندھی جریدوں میں شائع ہو کر مقبول عام ہوئے - اس دور کے افسانوں میں پیر حسام الدین کا افسانہ 'انارکلی' عبداللہ عبد کا 'اسکول ماسٹرنی'، لطف اللہ بدوی کا 'غربت' ہنگورانی کا 'دادو عبدالرحمان'، عثمان علی انصاری کا 'ململ کا کرتا' اور مرزا نادر بیگ کا 'مومنی' نمائندہ افسانے ہیں - اس دور میں موپاساں، چیخوف اور دوسرے مغربی افسانہ نگاروں کے نمائندہ افسانوں کو سندھی میں منتقل کرنے کا کام بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے تاہم جو طبع زاد افسانے لکھے گئے ان کی معیاری حیثیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا - سندھو، نئی دنیا، آشا اور کہانی اس زمانے کے وہ قابلِ ذکر سندھی رسالے ہیں جنھوں نے افسانے کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا -

جب برصغیر کی تحریکِ آزادی نے زور پکڑا تو اس کے اثرات بھی پوری توانائی سے سندھی اہلِ قلم کے ذہنوں پر پڑنے لگے - سندھی افسانہ نگاروں نے کھُل کر اپنے جذبات و احساسات کا اظہار افسانوں کی صورت میں کیا - شیخ ایاز، گوبند مالھی، موہن پنجابی، تیرتھ وسنت، رام پنجوانی کلیان اڈوانی، آتم اور تارا میرچندانی نے اپنے افسانوں میں آزادی کی تحریک کو مختلف موضوعات کے تحت بڑی عمدگی سے منعکس کیا ہے -

۱۹۴۷ء کے بعد سندھی مختصر افسانے کی ترقی کے امکانات نسبتاً زیادہ روشن ہونے لگے کیونکہ حصولِ آزادی اور تقسیم کے بعد سندھ کے مسائل میں ایسے بہت سے نئے مسئلے اور معاملے پیدا ہو گئے تھے جنھوں نے لوگوں کے فکر و نظر کو حالات کا نیا رخ دکھایا - کتنے ہی سماجی اور معاشی مسئلے ابھرے جن پر غور و فکر کی نئی راہیں پیدا ہوئیں - کتنی ہی پرانی رسمیں ایسے رِستے ناسور بن چکی تھیں جن پر نشتر زنی ضروری تھی - اس دور کے افسانوں میں نئے ماحول کا عکس ملتا ہے - باشعور افسانہ نگاروں نے اپنے قلم کی قوت سے اس خطے کے عوام میں ذہنی انقلاب پیدا کیا اور نئے افسانوں کو صحیح معنوں میں سماجی حقیقتوں اور زندگی کے نئے

تقاضوں کو اپنانے کا شعور ملا۔ کئی افسانہ نویسوں نے ہیئت و مواد کے نئے تجربے کئے اور فکر و فن کی نئی راہوں کو اپنانے میں پیش پیش رہے۔ تلاش و تجسس اور اخذ و قبول کے نئے میلانات سے سندھی افسانے کو اپنی مقبولیت بڑھانے میں خاصی مدد ملی اور نئے دَور کے افسانہ نگار اپنے نئے تجربات میں کافی حد تک کامیاب رہے۔

دوسرے دور کے مقابلے میں اس دَور کے بیشتر افسانے ہمارے ادب کا بیحد قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس دور کے افسانوں میں کہیں زمینداروں کے ظلم پر، کہیں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام پر بھرپور تنقیدی شعور کے ساتھ ساتھ شدید نفرت کا احساس ملتا ہے اور کہیں غریبوں کی آہوں کے پس پردہ فرسودہ نظام سے بغاوت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں بڑی بات یہ ہے کہ اس دَور کے مختصر افسانوں میں سندھی ماحول سے مطابقت رکھتی ہوئی سندھی زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ابھرتی ہے۔ ان افسانوں کے مطالعہ سے اس خطے کی اہم خصوصیات اور انکی فطری، سیاسی، تاریخی، قومی، سماجی اور اقتصادی تہہ داریوں کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ فنّی نقطۂ نظر سے بھی یہ افسانے زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ اس دَور کے افسانہ نگاروں میں شیخ ایازؔ، جمال ابڑو، ایازؔ قادری، شیخ رازؔ، غلام ربّانی، نسیم احمد کھرل، امر جلیل، ع۔ق۔ شیخ، عبدالغفور انصاری، شیخ حفیظ، ڈاکٹر نجم عباسی، ابن الیاس سومرو، غلام علی کھوکھر، محمد بخش جوہر، سراج المیمن، حافظ شاہ حسینی، رشید بھٹی، ابن حیات پنہور، عبدالرحیم جونیجو، بشیر موریانی، رسول بخش پلیجو، غلام نبی مغل، عبدالجبار شام، رانا بلڑائی، مقبول صدیقی، مراد علی اختر، جمال رند، حمید سندھی، طارق اشرف، ناصر مورائی، عبدالقادر جونیجو، شوکت راہی، علی بابا، نظیر شیخ اور مشتاق شورو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں میں بیگم چناّ، شمس صدیقی، ثریا یاسمین، ثمیرہ زرین، جمیلہ نرگس، ماہتاب محبوب، رشیدہ بلوچ لیلیٰ بانا اور فہمیدہ میمن کا شمار اچھے افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔

ان فنکاروں میں سے کئی ایک کے افسانوی مجموعے سندھی ادب میں خوشگوار اضافہ کر چکے ہیں۔ پنھل کھاں پوء، سفید وحشی، ڈاک بنگلو بلو دادا، پشو پاشا، منڈل افق، داستانِ غم، کراچی کی راتیں، چوٹ، زندگی کی راہ پر، تباہی، گگبدن، بھوک اور بیکاری، سوکھڑی، ابانو گھر، عورت، سیمی، اوجھنگاروں حسرت زدہ موت، ایک ندی دو کنارے، کام چور، پھول اور کلیاں، کروڑپتی، آبِ حیات

اور شبنم شبنم کنول کنول مشہور افسانوی مجموعے ہیں جن میں موجودہ دور کا عکس نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں بھی پچھلے پچیس سال میں بہت سے ایسے افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جنھیں ہمارے لکھنے والوں کی طرح مختصر افسانہ نگاری کے نئے میلانات کو پیش کیا گیا ہے۔

سندھی کے جدید افسانہ نگاروں میں ہر ایک کی اپنی حیثیت، اپنا نظریہ اور اپنی راہ ہے۔ ان میں شیخ ایاز نئے رنگ اور نئے ڈھنگ کا مالک ہے۔ اس کے افسانے میں مقامی ماحول اور مقامی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ شیخ ایاز کی کہانیوں کے ہیرا اور ہیروئین سندھی خد و خال کے ہیں جن کے سبب ایاز کے افسانے سندھی ادب میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔" پھل کھاں پوءِ (پنہوں کے بعد) اور "سفید وحشی" ایاز کے نمائندہ افسانوی مجموعے ہیں ان مجموعوں کے بہترین افسانے "لوزان"، "کلٹی"، "کارو رنگ"، "واچ جا کانٹا"، "مسافر کراچی" "پھل کھاں پوءِ" اور "سفید وحشی" ہیں۔

سندھی افسانہ نگاروں میں جمال ابڑو کو بھی اعلیٰ مقام حاصل ہے ان کا اسلوب بیان چھوٹے چھوٹے سجل فقروں، ٹھیٹ سندھی محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں سے عبارت ہے انہوں نے غلط قسم کی سماجی رسموں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ سماجی ناہمواریوں کے ستائے ہوئے مجبور، بیکس اور دکھی انسانوں کے کردار وہ بڑے چاؤ سے اپنے افسانوں میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اُن کرداروں سے انسان دوستی، خلوص و محبت اور حالات کو بدلنے کا جوش و خروش بڑے مؤثر انداز سے رونما ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ سندھ کے دیہی ماحول کی طرح سادہ ہوتے ہیں لیکن اس سادگی میں پسماندہ طبقے کے وہ تمام دکھ درد چھپے ہوئے ہوتے ہیں جنھیں جمال ابڑو کا فن ایسی دلگداز تصویروں کے روپ میں اس اچھوتے انداز سے اجاگر کرتا ہے کہ اُن تصویروں کو دیکھ کر ہر کوئی اپنے ذاتی دکھ درد بھول جاتا ہے اور ہر ایک کے دل میں ایثار و محبت کے جذبہ کے ساتھ ساتھ حوصلے کی قوت اور عمل کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ جمال کے افسانوں میں امیر طبقے کے نوجوانوں کی بے راہ روی پر گہرا طنز بھی ملتا ہے۔ خصوصاً وہ نوجوان جو مغربی تہذیب کے روشن پہلوؤں کو نظر انداز کر کے تاریک پہلوؤں کے شیدائی بن چکے ہیں۔ "پشو پاشا" ان کے نمائندہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔

ایاز قادری کے افسانے ملک کی معاشرتی و معاشی بدحالی کی سچی تصویریں ہیں۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے سماجی برائیوں، فرسودہ رسم و رواج اور جاگیر دارانہ نظام کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ وہ خود لکھتا ہے کہ "میرے افسانوں کے کردار نہ فرشتہ ہیں نہ شیطان بلکہ سیدھے سادے انسان ہیں جن میں کئی خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی ہیں۔"

'بلو دادا' ایاز قادری کے افسانوں کا ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے۔

غلام ربانی نے زیادہ تر اپنے افسانوں کی بنیاد خالص دیہی ماحول اور دیہی زندگی پر رکھی ہے۔ اس کے افسانوں کا خاص مقصد وڈیرہ شاہی کے خلاف نفرت پیدا کرنا ہے۔ منظر نگاری اور موزوں الفاظ کا انتخاب اس کے افسانوں کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں امر جلیل، آغا سلیم اور نسیم احمد کھرل بہترین لکھنے والوں کی صف میں شامل ہیں۔ امر جلیل، عریانی اور جنسیات کے موضوعات پر لکھنے کے شوقین نظر آتے ہیں۔
نسیم احمد کھرل نے کم عرصے میں بہترین افسانے لکھے ہیں اور ان کے افسانوں کو ادبی حلقوں میں خاصا پسند کیا گیا ہے فنی لحاظ سے بھی ان کے افسانے بیحد کامیاب ہیں۔ کھرل کے افسانوں میں طنزیہ افسانے زیادہ ہیں جن کا خاص مقصد قومی اور معاشرتی اصلاح ہے۔ وہ اصلاحی مقصد کے لئے معاشرے کے نقائص کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ انسانی برادری میں اخوت و مساوات کے قائل ہیں اور ہر انسان کو اپنا جیسا ہی سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ نسیم کے افسانوں پر تنقید کرتے ہوئے رسول بخش پلیجو لکھتے ہیں:۔

"نسیم کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بہر حال صداقت پسند، ہر جذبے کا وفادار اور مخلص ترجمان ہے۔ 'کافر' اس کی بے مثال کہانی ہے۔ اس کہانی میں اس نے اپنے تجربے سے بیان کیا ہے کہ ایک طرف تو اسلامی مساوات و اخوت اور ذات پات کے بندھنوں سے آزادی کے نعرے لگاتے لگاتے ہمارے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے اور دوسری طرف ہم سب سے پہلے ذات پات کی تفریق اور پست و بالا کے امتیازات کی حفاظت کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔"

کھرل کے افسانوں کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے نہ صرف فن افسانہ نگاری پر عبور

حاصل ہے بلکہ اس کا اسلوب تحریر بھی اپنی مثال آپ ہے۔ 'کتی آنگر' - 'گذریل واردات' کا فراوز کشن' کے پلاٹ سادہ اور مختصر ہیں لیکن یہ کھرل کا طرز تحریر ہی ہے جس نے ان افسانوں میں اس کی حقیقت نگاری کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے جیتے جاگتے کردار افسانوں کی دلکشی میں خاطر خواہ اضافہ کرتے ہیں۔

ماحول اور سماج کی تبدیلیوں کا اثر سندھی ادب کی دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری پر بھی ہوتا رہا ہے۔ سندھ کے جدید افسانے میں دوسرے مسائل کے ساتھ بین الاقوامی مسائل کے اثرات بھی رونما ہوئے ہیں۔ آج کا سندھی افسانہ جرمن، روس اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کی زبانوں کے افسانوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ سندھ کے جدید افسانے کی کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ کئی منتخب افسانوں کا ترجمہ انگریزی، روسی اور جرمن زبان میں ہو چکا ہے۔ اس طرح سندھ کے جدید افسانے کو ہمارے ادب کا بہترین ورثہ کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر تنویر عباسی

جدید سندھی شاعری

ہر دور کی شاعری اس کے اپنے زمانے کے لئے جدید ہوتی ہے۔ ہر دور میں شاعر کچھ پرانی روایتوں سے کنارہ کشی اختیار کرکے نئی روایتوں کی بنا ڈالتے ہیں موت ہمیشہ سے ہی زندگی کی خوراک رہی ہے۔ صرف مادّی دنیا میں ہی نہیں یہ اصول ذہنی دُنیا میں بھی کارفرما ہے جہاں کئی ادبی نظریات مردہ اور بے جان ہو جاتے ہیں اور کچھ نئے نظریے جنم لیتے ہیں۔

ہماری ذہنی دنیا کی تبدیلیاں نہ صرف ہماری ادبی اقدار کے رُخ کا تعین کرتی ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ ہمارے قومی و فطری تقاضوں اور زندگی کے مسائل کو سُلجھانے کی کوشش بھی کرتی ہیں اور یہ ذہنی تبدیلیاں بذاتِ خود بھی بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کا ردِ عمل ہوتی ہیں

ہماری کائنات صرف طبعی اضافیت (PHYSICAL RELATIVITY) ہی کی نہیں ذہنی اضافیت (MENTAL RELATIVITY) کی دنیا بھی ہے۔ ہر شاعر کائنات اور زندگی کے مسائل کو اپنے مخصوص رنگ میں محسوس کرتا ہے اس لئے اس کا انداز بیاں، اظہار، احساس اور تفکر منفرد اور جداگانہ ہوتا ہے۔ ہر شاعر کا ذہنی پس منظر اس کے اپنے ماحول سے ہی نہیں مورُوثی سرمایہ سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ نتیجتہً اس کی شخصیت دوسروں سے علیحدہ اور اس کے سوچنے سمجھنے اور بیان کرنے کا طریقہ دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ ہر مسئلے کو اپنی ذات کے حوالے سے محسوس کرتا ہے۔

جدید سندھی شاعری ایک وسیع اور اہم موضوع ہے جس کے سیر حاصل جائزے اور تنقید کا حق ادا کرنے کے لئے ایک طویل اور محنت طلب مضمون کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں عام اصطلاح کے مطابق آج کل کے ہر شعر اور ہر شاعر کو جدید سمجھتا ہوں۔ آج کا شعر خواہ فارسی تغزل کا نمونہ ہو، کلاسیکی کافی کی ہئیت سے متاثر ہو یا ترقی پسند خیالات کا ترجمان ہو۔

میں ان سب باتوں سے قطع نظر اُن خصوصیات پر اکتفا کروں گا جو موجودہ دور کی شاعری کو گذشتہ دور کی شاعری سے ممتاز کرتی ہیں لیکن جدید شاعری اور اس کی خصوصیات بیان کرنے سے پہلے ان واقعات و حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے جن کی کوکھ سے اس شاعری نے جنم لیا ہے۔

جدید سندھی شاعری کا بیج گو کافی پہلے بویا جا چکا تھا لیکن اس کا باقاعدہ آغاز قیام پاکستان کے بعد ہی ہوا۔ اس سے پہلے کی مروجہ شاعری فارسی کے کلاسیکی اور استادانہ رنگ میں رچی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی ایک مدت تک سرکاری زبان رہنے کی وجہ سے تعلیم کے لئے ضروری قرار دی گئی تھی۔ اس کا اثر شاعری پر ہونا لازمی تھا لیکن انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کا ادب جوں جوں متعارف ہوتا گیا ہماری شاعری میں ندرت آتی گئی۔ ہماری جدید شاعری مغربی فکر و عمل کی ویسی بھی تقلید نہیں ہے جیسی گذشتہ دور کی سندھی شاعری فارسی تشبیہات و استعارات کا ذخیرہ رہی۔ اس کے برعکس جدید سندھی شعراء نے سندھی لب و لہجے اور سندھی شاعری کی کلاسیکی روایات کو اجاگر کیا ہے۔

اس پس منظر کے مختصر بیان کے بعد اب میں ان خصوصیات کا ذکر کروں گا جو موجودہ دور کی شاعری کو گذشتہ شاعری سے ممتاز کرتی ہیں۔

ہماری جدید شاعری کا لہجہ شائستہ، مزاج نرم اور زبان سادہ و سلیس ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے آج کے شاعر اپنے قومی مزاج سے بخوبی واقف ہیں۔ سندھی شاعری کی خصوصیات اس کی اپنی قوم کی خصوصیات ہیں۔ اس کا انداز تخاطب انتہائی دلکش ہے وہ اپنے محبوب کو دلربا، مہ لقا، مہ جبیں اور ماہ وش کی بجائے سائیں، سوہنا، مٹھڑا، مٹھا وغیرہ الفاظ سے پکارتی ہے۔ اس کا پیار سندھ کی مٹی اور مہران کے کنارے کا پیار ہے اور اس لئے اس کا اظہار فطری معلوم ہوتا ہے۔

جدید شاعری کی دوسری اہم خصوصیت اس کی انفرادیت ہے۔ ہمارے دور کے ہر اچھے شاعر نے اپنی کاوش سے شعری تخلیق میں ذاتی مشاہدات، تجربات اور احساسات کو بیان کیا ہے اس طرح اس دور کی شاعری نے بہت سے نئے استعارات، تشبیہات، اصطلاحات اور محاورات سے سندھی ادب کو متعارف کرایا ہے تخلیقی صلاحیت شاعری یا کسی بھی دوسری صنف ادب کے لئے

مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ روایتی شاعری کی گھسی پٹی اصطلاحات سے بیزار ہو کر نئے شعرائے اپنی وسعتِ نظر سے کام لیا نرگسِ بیمار کے تصور کی بجائے نیم کے بُور اور سرسوں کے پھولوں کے حسن کو سمیٹ کر اپنی شاعری میں دلکشی پیدا کی ہے۔

مہندی پھوٹنے لگی ہے دوست، نیم میں بور آگیا ہے

تو کب تک مجھ سے دور رہے گا

آ۔ کہ سرسوں میں پھول آرہے ہیں۔ میرے محبوب!

(شیخ ایاز)

آج کی شاعری اور روائتی شاعری میں دوسرا نمایاں فرق ماحول کا ہے۔ شاعری دنیا کے کسی بھی حصے کی ہو اس کا تعلق انسان کی اعلیٰ بنیادی جبلتوں (INSTINCTS) مثلاً حسن پرستی، وطن دوستی زندہ رہنے کے جذبے وغیرہ سے ہوتا ہے۔ شاعری جذبات و احساسات کا اظہار ہے اور احساس و جذبہ ان ہی بنیادی جبلتوں کی شاخیں ہیں۔ ہر قوم کی بنیادی شاعری میں ان ہی جبلتوں کی نشاندہی اس کے اپنے مخصوص رنگ اور ماحول میں کی جاتی ہے جو اس قوم کے جغرافیائی، تہذیبی، معاشرتی اور نفسیاتی صورتِ حال کا آئینہ ہوتا ہے۔ سندھی کی روائتی شاعری جو فارسی کے زیرِ اثر پروان چڑھی تھی۔ زیادہ تر ایران کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے جیسے روائتی محفلیں، ساقی و مئے، رند، رقیب و سیہ، سرو کے پودے اور نرگس کے پھول وغیرہ۔ قدیم شاعری میں ایسے مضامین کی بھرمار ہے کہ "ہمارے گھر گھر میں نرگس اور گلی گلی میں سرو کے پودے اگ آئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم شعرا ذاتی مشاہدے، احساس اور تاثر سے زیادہ مطالعے کے سہارے شعر کہا کرتے تھے جو اُن میں قوتِ تخلیق و مشاہدہ کے فقدان کی دلالت کرتا ہے۔

آج کے سندھی شعرائے حسن کے روایتی تصوّر کو ترک کرکے مطالعے کا سہارا لینے کی بجائے اپنی ذاتی قوتِ مشاہدہ سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ اپنے احساس کی لطافت کا استعمال کرتے ہوئے انہوں نے سرسوں کے پھولوں کی خوشبو پھیلا کر اندھیری راتوں میں روشنی کی جھمکار لگا دی ہے۔ خیالات کے افق پر کونجوں کی ڈاریں پرواز کر رہی ہیں اور ان کے احساس کی شدت سے سندھ کی لہروں میں شدت اور ہلچل پیدا ہو گئی ہے۔

جدید شاعری محض قید خانے میں ایک بار جھانکتی نہیں بلکہ قیدی کے اندر کا عمیق مطالعہ اپنی گرفت میں لاتی ہے۔

یہاں گھنٹی سے صبح ہوتی ہے گھنٹی سے شام ہوتی ہے
وقت گزرنے کا پتہ دیتی ہوئی گھنٹی کتنے رنگ بدلتی ہے
چھوٹی گھنٹی، بڑی گھنٹی
لیکن دل میں ہر دم اندھیرا
پہرے داروں کے قدموں کی چاپ میں اندھیرے میں سنتا ہوں
رات تاریک ہو یا روشن میں سارا آسمان نہیں دیکھ سکتا۔

(ہری دلگیر)

آج کا شاعر کچے گھروں کے مکینوں کے ساتھ اُن کی سرگرمیوں میں شریک ہے:

"بوڑھیاں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر اپنی جوانی کی کہانیاں کہیں گی
ناک پر انگلی رکھ کر انوکھی باتیں کریں گی
سہیلیاں قطاروں میں بیٹھ کر اپنی ہمراز تلاش کریں گی
اور جب وہ اپنے من میں چھپے ہوئے راز کھولیں گی
تو عاشق بے قرار آئے گا
پودوں پہ رم جھم برکھا ہوگی اور سنگھار میں بناؤ آئے گا"

کبھی کبھی شیخ راز جیسا شاعر کسی کنوئیں کی طرف نکل جاتا ہے اور کہتا ہے:

"کیا وہ کنوئیں کی طرف پھر دوبارہ آئے گی
جسے میں نے کل دیکھا تھا
جس کی کمر پہ ایک گھڑا تھا
جس کی پازیب کی جھنکار
جس کی چوڑیوں کی چھنک
جس کے کڑوں کی جھنک سے ایک نیا ساز بجا

کس نے یہ نرالا راگ چھیڑا
اور میں نے ایک انوکھا گیت سُنا
جس سے میرے شعروں کے بند
آپ ہی آپ ترتیب پانے لگے" (راز)

رات، اکیلاپن، یاد اور دیا ۔ شاعر نے ان سب کا کیسا نفسیاتی نقشہ پیش کیا ہے:-
"سردیوں کی تمام راتیں میں نے سِسک سِسک کر کاٹی ہیں
تیری یاد میں دیا سرہانے رکھ کر میں تیرے انتظار میں جاگتا ہوں"
(بردو سندھی)

آج کا شاعر پہلے سے ڈھلی ڈھلائی تشبیہات، اصطلاحات اور علامات کی بجائے اپنے ذاتی مشاہدے اور فکر و احساس کو پیش کرتا ہے ۔ اس کی کائنات کشادہ اور وسیع ہے اس کے قاری پڑھے لکھے اور سمجھ بوجھ کے مالک ہیں اس لئے شاعر ان کی توجہ کسی مسئلے کی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہتا ہے ۔

ایک طرف تو شاعر کا اظہار جامع اور مکمل ہے اس کا شعر تاثر سے بھرپور ہے دوسری طرف قاری شعر کی گہرائیوں میں اُتر کر اس سے حقیقی معنوں میں لطف اندوز ہوتا ہے ۔

جدید شاعری کی ایک اور خصوصیت کلاسیکی ادب کے ورثوں کی حفاظت کرنا ہے ۔ ہمارے کلاسیکی شعراء مثلاً شاہ لطیفؒ، سچل سرمست، سامی اور حمل وغیرہ کی شعری ہیئتوں مثلاً بیت اور کافی وغیرہ کو جدید شعراء نے از سر نو زندہ کیا ہے ۔ آج کل بیت، کافی اور دوہے دو مختلف طریقوں سے لکھے جا رہے ہیں ۔ ایک گروہ نے ہئیت کے ساتھ ساتھ ان کے موضوع، زبان اور اسلوب بیان کے کلاسیکی انداز کو برقرار رکھا ہے جبکہ دوسرے گروہ نے ہئیت تو پرانی ہی رکھی ہے لیکن موضوعات اور اسلوب کی بندش کو ختم کر دیا ہے ۔

پہلا گروہ اپنے تقلیدی انداز کی بناء پر کوئی قابلِ قدر تخلیقی کارنامہ انجام نہیں دے سکا لہذا اس کا ذکر ہی بیکار ہے ان شعراء کا عالم بھی فارسی شاعری کے تقلیدی شعراء

جیسا ہے۔ محاوروں کے انبار اور گھسے پٹے موضوعات کو الفاظ کا جامہ پہنانا کوئی تخلیقی کارنامہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

دوسرے گروہ نے ان ہیئتوں کو نئے موضوعات کے لئے استعمال کیا ہے مثلاً ڈاکٹر علی احمد کی کافی (سنہ ۱۹۶۰ء) "ستھرِ ایٹم کے دھماکے" یا ایاز کے بیت جیسے ۔

سانس کو برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ کھانے کی ضرورت رہتی ہے
بھوک خوب صورتی کے تمام احساسات کو مٹا دیتی ہے

کلاسیکل شاعری کے موضوعات کو جدید شعراء نے نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھال کر اور نئے رنگ میں رچا کر استعمال کیا ہے۔ سسئی، ماروی اور بیجل کی بجائے ہمارے فارسی زدہ شعراء قیس و لیلیٰ، شیریں اور فرہاد کی تکرار کرتے رہے لیکن نئے شاعروں نے اپنی شاعری کی بنیاد سندھ کی کلاسیکی روایتوں پر رکھی ہے اور انھیں نئے طرز سے استعمال کیا ہے۔

گزنار کو آہستہ آہستہ جلاؤں
پھر سے سُر لگاؤں اور چنگ بجاؤں

(ایاز)

زندگی سسئی کے دکھ کی طرح نہ بنے
اور اُس مُومل کے انتظار کی طرح نہ ہو

(نیاز ہمایونی)

موضوعات کی فراوانی جدید سندھی شاعری کا خاص وصف ہے، ورڈز ورتھ کے لئے چھوٹے چھوٹے پھول اور گاؤں کی لڑکی، شیلے کے لئے چکورا اور کیٹس کے لئے بلبل حسنِ فطرت کے مظاہر تھے جنھیں انہوں نے اپنے اشعار میں استعمال کیا۔ ہمارے فارسی زدہ شاعروں نے اپنے موضوعات کتاب فطرت میں تلاش کرنے کی بجائے لائبریریوں کی کتابوں سے چُنے۔ قدرت کے حسین اور دلکش نظاروں اور چھوٹی چھوٹی روزمرہ باتوں کو انہوں نے قابلِ توجہ نہ سمجھا۔ آج کا شاعر صرف اپنے ذاتی مشاہدے اور فکر ہی کے زیرِ اثر تخلیق نہیں کرتا بین الاقوامی حالات کا ردِّ عمل بھی اُس کی شاعری کا حصہ ہے۔ آج کی دنیا میں ادبی رشتے بین الاقوامی

سرحدوں سے منسلک ہیں۔ شیخ ایاز معذور ہرن اور تھوہڑ کے پودے جیسی عام چیزوں کے حوالے سے زندگی کے فلسفے پر بحث کرتا ہے۔ ہری دلگیر بمبئی کے شہر کو دیکھ کر انسان کی میکانکی زندگی کے راز سے پردہ اٹھاتا ہے اور بردو سندھی چنے کے پھولوں اور دالوں کی چوری کی مدد سے اپنے تخیل کی اڑان بلند کرتا ہے۔ بین الاقوامی مسائل پر نیاز ہمایونی کی 'ایشیا' بشیر موریانی کی 'مشرقِ وسطیٰ' اور ایسی ہی دوسری بہت سی نظمیں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

جدید شاعروں نے ہئیت میں نت نئے تجربات کئے ہیں۔ یہ موضوع بذات خود بےحد وسیع ہے اور اس پر بحث کے لئے ایک الگ مضمون درکار ہے۔ بہرحال چند چیدہ چیدہ باتیں یہاں بیان کی جاتی ہیں:۔

۱۔ غیر ملکی زبانوں کی مروجہ ہئیتیں (FORMS) نئی سندھی شاعری میں عام طور پر استعمال کی جا رہی ہیں آزاد نظم اور سانیٹ ان میں قابل ذکر ہیں۔

۲۔ کلاسیکی ہئیتیں (FORMS) مثلاً بیت، کافی اور وائی موضوعات میں وسعت و تنوع کے ساتھ استعمال کی جارہی ہیں۔

۳۔ کلاسیکی ہئیتیں (FORMS) اور فارسی کی شعری تکنیک کو ملا کر نئی ہئیتی تکنیکیں پیدا کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں بردو سندھی اور شیخ ایاز کا نام قابلِ ذکر ہے۔

۴۔ گیت کے مصرعوں اور مصرعوں کے ارکان کی تعداد میں تبدیلی کر کے اظہار کے نئے طریقے دریافت کئے گئے ہیں۔

۵۔ غزل کو فارسی کے کلاسیکی رنگ سے آزاد کر کے سندھی ماحول، اسلوب اور موسیقیت سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔

ان تجربات کی مثالیں طوالت کے ڈر سے نہیں دی گئیں ورنہ جدید سندھی شاعری ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔

جدید سندھی شاعری کی ایک خاص صفت اس کی موسیقیت اور اس کا ترنم ہے۔ قدیم شاعری اگرچہ اس سے عاری نہیں مگر اسلوب بیان کی طرح اس پر بھی ایرانی رنگ غالب تھا حالانکہ ہر زبان کے اپنے صوتی اشارے، اپنا لب ولہجہ اور اپنی موسیقیت ہوتی ہے۔ سندھی زبان کی موسیقیت سے آگہی یا تو کلاسیکی شعراء کے بیان سے ہوتی ہے یا جدید شعراء کے کلام میں اس کے الفاظ اور آہنگ کی نرمی کا صحیح تاثر ابھرتا ہے۔

امداد حسینی

نئی لوک کلاسیکل شاعری

پاتال کو کون چھو سکا ہے۔ ہاں چند سر پھرے سے لوگ ہوتے ہیں جو پاتال کو چھونے کی لگن ضرور رکھتے ہیں۔ میری بات سمجھنے کے لئے آپ کو بھی اپنے من میں ایسی ہی لگن کی لَو روشن کرنی ہوگی۔ سچ مانیں جس موضوع کو میں نے آج چھیڑا ہے وہ صدیوں سے میرے ذہن میں جاگتا رہا ہے لیکن مجھے اس موضوع کو نبھانے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ اس ترنگی لہر (نئی لوک کلاسیکل) کا یہ روپ سروپ میں یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے میں اسے پوری طرح اجاگر نہ بھی کر سکوں لیکن یہاں پھر وہی پاتال کو چھونے والی بات پیش نظر رکھنا ہوگی۔

میں شمشیر الحیدری کی نظم "انت بحر" جب بھی پڑھتا ہوں تو نرمل لہروں کی مدھر مدھم جھنکار کانوں میں رس گھول دیتی ہے اور مجھے شاہ یاد آجاتے ہیں:۔

"انت بحر دي ڪل نہ ڪوئي رنگسي منگ بنايا"

"شمشیر کی 'انت بحر' میں سچی سوچوں کے نیلے پانیوں کی پاتال سے ایک لہر ابھر کر دوڑتی، پتھروں سے ٹکراتی ساحلوں پر اپنا سر پھوڑ لیتی ہے تب کہیں جا کے 'انت بحر' کے پاتال کا بھید کھلتا ہے۔

انت بحر جي انت نہ ري ڄر   سڀين سندر موتي سيپ جن

یہ وہی موتی ہیں جن کا ذکر شاہ لطیف نے سُر سری راگ میں کیا ہے اور ان موتیوں کو حاصل کرنے کے لئے سمندروں کو کھنگال کر رکھ دینے کی تلقین کی ہے۔

"اگر ان موتیوں کا ایک ماسا بھی مل جائے تو بچاری مالا مال ہوجائے۔"

میں نے اپنے ایک مضمون "یہ سین نہ دے گی چین" میں بھی لکھا تھا کہ نئی شاعری نے سندھ دھرتی کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور یہی اس ترنگی لہر (نئی لوک کلاسیکل) کی اہم بنیادی اور مشترکہ لے ہے۔ اسی مضمون میں میں نے سندھ کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا تھا۔ یہ پھل پھول اپنی اپنی

رُتوں میں جنم لیتے ہیں اور رُت بیتے جھڑ جاتے ہیں پھر مٹی میں رل کر مٹی ہو جاتے ہیں لیکن یہ پھل اور پھول مرتے نہیں بلکہ دھرتی سے لپٹ کر سوندھی مٹی کو سرہانے رکھ کر میٹھی نیند سو جاتے ہیں اور آنے والی رُتوں کے سہانے سپنوں میں کھو جاتے ہیں پھر جب نیل گگن پر بھورے بھورے بادل چھا جاتے ہیں شمال کی ہوا چلنے لگتی ہے۔کوئل کی کوک کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے اور جب برسات کا پہلا چھینٹا پڑتا ہے تو یہ پھل اور پھول پھر سے جاگ پڑتے ہیں پھر یہ جیون سُر سارنگ کی طرح لگتا ہے ؎

اج جي ڪالي ٻوندپئي
جيون ٿي ڏيو سر سارنگ (ایاز)

پھولوں اور پھلوں کے سونے اور جاگنے کا منظر اتنا سُندر ہوتا ہے کہ اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔آپ اگر اس منظر کو جیتا جاگتا دیکھنا چاہتے ہیں تو نئی لوک کلاسیکی شاعری کو پڑھنا ہوگا یا تال کو چھونا ہوگا۔

موجودہ دور کی شاعری میں جس کے لئے میں نے نئی لوک کلاسیکل شاعری کی اصطلاح تخلیق کی ہے آپ کو تینوں ادوار کی جھلک ملے گی۔تینوں ادوار کی شاعری میں زبان، ہئیت اور مواد کی اس قدر یکسانیت ہے کہ اس پر اگر کسی شاعر کا نام نہ دیا گیا ہو تو آپ مشکل سے یہ جان پائیں گے کہ اس تخلیق کا کس دور سے تعلق ہے۔مثال کے طور پر اگر آپ کے سامنے ایازؔ کے بیت اور وائیاں رکھ دی جائیں۔تنویر عباسی کے گیت گنگنائے جائیں یا نارائن شیام کے دوہے اور سورٹھے گائے جائیں تو آپ کو ان میں اُسی رس اور مٹھاس، رنگ اور سگندھ کا احساس ملے گا جو سندھی شاعری کی خصوصیت ہے۔

تنویر کے 'کیڈارو' سندھی رزمیہ شاعری کی مثال دیتا ہوں۔بلاشبہ یہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔یہ ان طلبا کو خراج تحسین تھا جو ۴ مارچ ۱۹۶۷ء میں حیدرآباد کی جام شورو روڈ پر نوکر شاہی کے خلاف صف آرا ہوئے تھے اور ان نہتے طلبا نے نوکر شاہی کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا۔

تنویر کے دوسرے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے 'کیڈارو' پر میں نے ایک الگ باب لکھا تھا کیونکہ 'کیڈارو' کی سندھ کے تاریخی پس منظر میں ایک الگ روایت رہی ہے۔شاہ لطیف کے

کیڈارو سے لے کر خلیفہ نبی بخش قاسم کے کیڈارو تک اور قاسم کے کیڈارو سے تنویر کے کیڈارو تک لال لہو کی لکیر کھینچی گئی ہے اور یہ وہی لال لکیر ہے جو دراوڑوں سے لے کر آج تک کہیں نہیں ٹوٹی۔

موجودہ دور میں نہ صرف وائی، بیت، کافی اور گیت جو لوک کلاسیکل اصناف ہیں۔ سندھی، ہندی چھند کے بحر و وزن پہ لکھی جا رہی ہیں بلکہ غزل، نظم اور آزاد نظم میں بھی یہی بحر استعمال ہو رہی ہے۔ نارائن شیام نے جو جاپانی صنفِ شاعری ہائیکو، کو سندھی شاعری میں متعارف کرایا تو اس نے بھی سندھی ہندی چھند کو بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا۔

سانرکیل پت سان

سنداکیون چپ گائٹو

راگنٹ ساٹ رهاٹ

آپ نئی سندھی شاعری کا مطالعہ کریں گے تو ان میں وہی کردار اور علامات پائیں گے جو لوک کلاسیکل شاعری میں ملتی ہیں مثلاً ماروئی، سسئی، مومل، نوری، مومل، رانو، سورٹھ، ڈیاچ، بیجل، دودو اور جیسر وغیرہ اب ان علامات اور کرداروں کو نئے حالات کی مطابقت سے پیش کیا جاتا ہے کیونکہ جب آپ وطن پرستی کی بات کرنا چاہیں گے تو ماروئی کو کبھی نہیں بھول سکیں گے۔ عقل و دانش کی مثال دیں گے، تو رڑو اور رانو کے علاوہ اور کون ہیں جو دانا و بینا ہیں۔ حسن کا ذکر کرنا چاہیں گے تو مومل کی آنکھوں کے الماس آپ کی روح میں کھب جائیں گے۔ اسی طرح ڈیاچ قربانی کا عظیم لازوال پیکر ہے۔ چارن (بیجل) موجودہ دور کا شاعر ہے جو آج بھی سر مانگنے کی صدا دے رہا ہے لیکن ڈیاچ کوئی نہیں۔ بہادری۔ دلیری اور دھرتی کے لئے مرمٹنے کا جب بھی ذکر ہوگا۔ دودو، دولھ دریا خاں کو آپ بھلا نہیں سکیں گے۔

ان تاریخی کرداروں اور علامات کے علاوہ نئی شاعری میں آپ کو نئے کردار اور نئی علامات بھی ملیں گی جیسے ہوشو، ہیموں، بلو، حیدر بخش جتوئی، یوسف لغاری، مائی بختاور، ریاض اختر اختر بلوچ، ہاری صادق، جی۔ ایم سید، یوسف جکھرانی، یوسف تالپور، لالہ قادر اور سندھڑی کے دوسرے کئی سپوت بہت سے بیٹے اور بیٹیاں جنھوں نے سندھ کی قومی تحریک میں بھرپور حصہ

لیا اور شاندار قربانیاں دیں۔

ایاز کی طویل ڈرامائی نظم "دودی جی موت" اور نیاز ہمایونی کی طویل نظمیں "ساٹیبھ جی ساک" اور "ہنگاج" ماضی کے تاریخی واقعات کے پس منظر میں ہیں لیکن حال میں لکھی گئی یہ نظمیں مستقبل میں بھی پڑھی جائیں گی اور زیادہ اہمیت اختیار کریں گی۔

موجودہ دور کی شاعری میں لوک کلاسیکل اصناف وائی، بیت، کافی، گیت، مورو، ہوجمالو پنہاری، چینیو وغیرہ کے ساتھ ساتھ آپ کو غزل، نظم، نظم معری، ترائیل، سائیٹ اور ہائیکو جیسی جدید اصناف بھی ملیں گی۔ یہاں ایک خصوصیت اور بھی ان تین ادوار کی شاعری میں مشترک ہے اور وہ ہے فارسیت زدہ بے تعلق روایتی دور کی تصنع اور لگی لپٹی اجنبیت سے بغاوت کا احساس۔

شیخ عبدالرزاق راز

اپنوں سے بچھڑا پنچھی

اکّی کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے میرے لئے تحفہ بھیجا۔ درحقیقت اس کا نام اقبال ہے لیکن اسے پیار سے اکّی کہا جاتا ہے۔ یوں تو وہ سینیئر کلاس ون آفیسر ہے اقبال صاحب یا اقبال احمد خان کے ناموں سے مشہور ہے۔ اس کا خوب صورت تحفہ ملا۔ وہ ایک بڑا شکاری ہے اور اس کا یہ ذوق و شوق اب عروج پر ہے۔ اس نے کئی حسین جانوروں اور خوب صورت پنچھیوں کا شکار کھیلا ہے۔ میں اس کی نفسانی خواہشوں کا اکثر مذاق اڑاتا ہوں۔ وہ بہت سی دلیلیں دیتا ہے اور میں سب کو رد کرتا ہوں۔ ہاں شکار کھانے میں میں اس کا ساتھی توہا ہوں۔ میری منطق یہ ہے کہ شکار کرنا گناہ ہے اور شکار کھانا ثواب وہ میری اس عجیب و غریب منطق پر ہنستا ہے! دیبوں اور شاعروں سے اسے چڑ ہے۔ پوری عمر اس نے ریاضی کے چکر میں دو اور دو چار سے زیادہ نہ سوچا۔ ادب سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے اسی لئے وہ ہمارے حال پر ہنستا اور ہماری تخلیقات کو وقت کا زیاں سمجھتا ہے۔ انفرادی زیاں، اجتماعی زیاں اور قومی نقصان۔

اختلاف رائے کے باوجود ہماری آپس میں بڑی محبت ہے۔ اس نے میرے پاس تحفہ بھیجا اور وہ یقیناً مجھے شاعر سمجھتا ہے تحفہ واقعی خوب صورت تھا۔ ایک سندر پنچھی جس کا رنگ بادامی تھا۔ اس کے نرم و نازک پروں کو چھونے سے ایک عجیب سا سرور محسوس ہوتا تھا۔ اس کی لمبی اور لال چونچ بڑی دلکش تھی۔ اس کے گلے کی کالی مالا ظاہری حسن میں اضافہ کرتی تھی۔

اقبال مجھے شاعر سمجھتا تھا اور شاعر ہمیشہ دکھ کی باتیں سوچتا ہے۔ اپنے عالم فراق کی روداد پروانے، بلبل اور چکور کی زبان سے بیان کرتا ہے۔

میں نے پتنگوں کو اکثر بجلی کے بلب پر منڈلاتے دیکھا ہے۔ شاعروں کے تخیل میں یہ پتنگے ہیں یا کچھ اور، ہاں آگ میں جلتے ضرور ہیں۔ بلبل کو بھی دیکھا ہے جو گل کی بجائے ڈیلھوں کے پیچھے دوڑتی ہے۔ البتہ چکور کو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ کالی مالا والا ناسی چکور اقبال نے میرے پاس بھیجا تھا۔ یہ بیحد پیارا

پنچھی تھا۔

یہ ہمارے گھر میں ایک نیا اور اجنبی مگر جاذبِ نظر مہمان تھا جسے دیکھ کر ہم سب بڑے خوش ہوئے تھے۔ یہ تحفہ میری بیوی کو بھی بہت پسند آیا۔

مَیں نے اسے پنجرے میں بند کیا اور شکاریوں سے پوچھ گچھ شروع کی تاکہ اس کی خوراک کے بارے میں معلومات حاصل کرسکوں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ پتھر اور پہاڑی گھاس کھاتا ہے۔ گھاس کی کئی قسمیں اکٹھا کیں جو اسے پسند نہ آئیں۔ اس کی خوراک میرے لئے ایک بڑا مسئلہ بن گئی۔ بجری اور طرح طرح کے پتھروں کے ریزے بھی مہیا کئے لیکن وہ بددِلی سے انھیں ٹھونگے مار کر مایوس اور ملول رہنے لگا۔ میری بیوی کچھ غصہ کرنے لگی۔ "اقبال نے تو یہ ہمارے لئے بڑا آزار پیدا کردیا۔ یہ مرگیا تو اس کا پاپ کس کے سر ہوگا۔" مَیں نے کہا۔ "کتنی خوبصورت چیز ہے بڑی بڑی کوششوں سے ایسی شے ملتی ہے۔" "یہ محض آپ کی شاعرانہ سوچ ہے۔ یہ بیچارہ تو اپنوں سے بچھڑ کر مر رہا ہے۔" مَیں نے ہنس کر کہا۔ "واقعی اس نے جدائی میں بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔" وہ چڑ کر کہنے لگی ہے۔ "مَیں اسے ابھی چھوڑتی ہوں جہاں کا ہوگا وہیں چلا جائے گا۔" "خبردار ایسی حرکت نہ کرنا مجھے اس کو دوست بنانا ہے۔" "تم تو کہتے تھے کہ چاند کا شیدائی ہے اور حُسن کا عاشق۔" "تم بھی تو گئی گذری نہیں ہو تم سے ہی عشق کرے اور ہمارے پاس رہے۔"

وہ منہ پھلائے چلی گئی اور میں دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ شام کو جب میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ زاہدہ بڑی خوش تھی اس نے خوشی میں آواز لگائی۔ "دیکھو یہ تمہارا دوست اب کیسا خوش بیٹھا ہے اسے باجرہ پسند آیا جو بڑے شوق سے کھا رہا ہے۔" "جی نہیں۔ تمہیں پسند کرلیا ہوگا۔ عاشق ہمیشہ حُسن کی جستجو میں رہتا ہے۔"

"تم تو جلانے کی باتیں کرتے ہو۔ دیکھو تو اب کیسا اچھا لگ رہا ہے۔ مَیں نے اسے نہلایا بھی ہے۔" چکور ہفتے عشرے ہی میں ہم سے خوب گھُل مل گیا۔ زاہدہ نے اس کو بسکٹ اور کیک کھانے کی طرف بھی مائل کردیا۔ وہ فخریہ کہتی۔ "دیکھو اب یہ پنچھی شہری بن گیا۔ اپنی پہاڑی عادتیں سب چھوڑتا جاتا ہے۔"

اس کا پنجرہ اکثر کھلا رہتا تھا۔ وہ ڈرائینگ ہال کی چھت کے گرد چکّر لگا کر بجلی کے بریکٹ پر

بیٹھ جاتا۔ کبھی سیر کرتے ہوئے برآمدے میں آنکلتا لیکن کھلے آنگن میں آتے ہوئے ہچکچاتا تھا اور کبھی آ بھی جاتا تو اُداس اُداس نظروں سے چپ چاپ آسمان کو تکتا رہتا۔

دو ہفتوں کے بعد وہ زاہدہ کے سر پر چکر لگاتے ہوئے اس کے ساتھ باورچی خانے کی طرف جانے لگا۔ بڑے ادب سے وہ نعمت خانے کے اوپر بیٹھ جاتا۔ کھانے کی میز پر وہ ہمارے ساتھ ہوتا اور میں بڑے پیار سے اس کے نرم پروں پر ہاتھ پھیرتا جاتا۔ ایسا کرنے سے مجھے دلی سکون سا محسوس ہوتا تھا۔

میری بیوی بھی اب اس کی گرویدہ ہو چکی تھی۔ وہ بھی اتنا بے تکلف سا ہو گیا کہ اس نے پھدک کر زاہدہ کے شانوں پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ ایسے موقعوں پر میں کہتا "چکور کو اپنا چاند مل گیا ہے۔" زاہدہ تنبرا جاتی۔

میری اور زاہدہ کی شادی کو تین سال ہوئے تھے۔ زاہدہ ایک الہڑ اور سادہ مزاج دوشیزہ تھی۔ تعلیم کے لحاظ سے وہ ایم۔ اے تھی۔ اس کی معصومیت نے مجھے اپنی طرف مائل کیا۔ یونین کے الیکشن کے زمانے میں مجھے اس سے قریب ہونے کا موقعہ ملا۔ اس کے چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔

اب زاہدہ کی توجہ کا مرکز ایک پنچھی بن گیا تھا۔ پنچھی پنچھی ہی ہوتا ہے انسان تو نہیں جس سے رقابت پیدا ہو۔

ایک دن شام کو ممتاز اور شہناز اپنی نئی مزدا کار میں ہمارے گھر آئے ہمیں بڑی خوشی ہوئی۔ ممتاز میرا پیارا دوست اور شہناز میری زاہدہ کی سہیلی۔ وہ یونیورسٹی کی چنچل اور بیحد زندہ دل طالبہ رہی تھی۔ نہایت خوبصورت تھی۔ ممتاز بھی خوبرو جوان تھا اور ایک بڑے باپ کا بیٹا۔ اس نے جال پھینکا اور شہناز اس جال میں پھنس گئی۔ اب اس کا غرور ختم سا ہو گیا تھا اور وہ شوخی مٹ گئی تھی جو کبھی پہلے اس کی شخصیت کا لازمی حصہ تھی۔ ایک سال پہلے ہم ان دونوں کی شادی میں شریک ہوئے تھے۔ شہناز نے زبردستی ہمیں آٹھ دس دن کے لئے حیدرآباد میں ٹھہرا لیا تھا۔

رات کے کھانے پر شہناز بولی "بھائی! پوچھتے بھی نہیں کہ ہم کس لئے آئے ہیں۔"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے اپنے گھر میں کسی سے کیا پوچھنا۔"

"تو سن لیجیے کہ ہم لوگ آپ کو لینے آئے ہیں۔"

حسبِ معمول چکور میز پر آ بیٹھا اور شہناز کو گھورنے لگا۔ شہناز نے اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کتنا خوبصورت پرندہ ہے۔"

زاہدہ بولی "تیرے حسن کا نظارہ کر رہا ہے۔"

میں نے لقمہ دیا "یوں بھی تو یہ چکور ہے۔ چاند کا شیدائی۔ بھلا شہناز کے مقابلے پر زاہدہ کی کیا حیثیت۔" زاہدہ ہنس دی اور طنزاً کہنے لگی "یہ متواہر جائی ہے۔ آج تک یہ مجھ پر شیدا تھا لیکن اب شہناز کو دیکھ کر باؤلا ہو گیا ہے۔"

شہناز کہاں چوکنے والی تھی بھڑک اٹھی "تجھے تیرا عاشق مبارک ہے سنبھال اس کو۔"

سب کھانا کھانے بیٹھے اور چکور حسبِ دستور زاہدہ کے کاندھے پر بیٹھ گیا۔ ممتاز مسکرا رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد شہناز سیب چھیلنے لگی۔ چکور نے اس کی طرف دیکھا تو سیب کا ایک ٹکڑا دور سے اس نے دکھایا۔ اب چکور زاہدہ کے کاندھے سے اتر کر شہناز کے قریب آ بیٹھا۔ سب ہنس دیئے۔ ممتاز بولا۔ "عشق سے زیادہ پیٹ پیارا ہوتا ہے۔"

چکور سیب کی طرف بڑھا تو شہناز اسے چھپا لیتی اس پر ممتاز نے اسے پیار سے کہا "شہناز! اب اس بیچارے کو سیب دے بھی دو۔ اس نے عشق چھوڑ رکھا ہے۔"

میں نے رائے ظاہر کی "یہ بہت سمجھدار ہے۔ پہلے پہل تو بڑا مایوس و ملول رہتا تھا۔ اب تو زاہدہ سے دوستی ہو گئی ہے۔ پہلے پنجرے میں بند ہوتا تھا اب آزاد ہے۔"

زاہدہ چہکی "آٹھ مہینے سے یہ ہمارے پاس ہے شام کو ہمارے ساتھ موٹر میں گھومنے چلتا ہے جی چاہتا ہے تو نکل کر کھلے آسمان کی وسعتوں میں اڑتا ہے اور کبھی موٹر کی چھت پر بیٹھا رہتا ہے۔"

ممتاز دفعتاً چونکتے ہوئے بولا "اچھا بھابی! اب سن لو کہ کل ہمیں کوئٹہ چلنا ہے۔ ان دنوں کوئٹہ کا موسم بیحد سہانا ہے۔"

"بھائی! میں تو بالکل تیار ہوں۔ ان سے پوچھئے جو کہہ دیں گے کہ چھٹی نہیں۔"

میں نے کہا "بھائی! چھٹی تو لینا ہی پڑے گی کراچی سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔"

شہناز بولی "ہم ایک دن اور ٹھہر جائیں گے کوئی جلدی تو نہیں۔"

تیسرے دن صبح کو ہم کوئٹہ کے لئے روانہ ہوئے چکور زاہدہ کی گود میں تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ چھلانگ لگا کر شہناز کے کاندھے پر بیٹھا۔ شہناز فرنٹ سیٹ پر ممتاز کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے

چکور کو ایک کیلا کھلایا۔ وہ آنکھیں بند کئے مزے سے کھاتا رہا۔ شاید اسے شہناز کے لباس میں سینٹ کی تیز خوشبو نے مدہوش کر دیا تھا۔

ہم پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ چکور کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف پھدکنے لگا۔ ہم بڑی خوشی سے اس کے کرتب دیکھ رہے تھے۔ راستے کی اونچائی بڑھتی جاتی تھی۔

ایک جگہ وہ کار کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ ہم خاصی بلندی پر جا کر ٹھہر گئے تاکہ بلند پہاڑوں کے فطری مناظر سے لطف اندوز ہو سکیں۔

میرے من میں چکور کے واپس آنے کی کرید تھی۔ قریب قریب ایک گھنٹے تک ہم وہاں ٹھہرے رہے مگر چکور واپس نہ آیا۔ زاہدہ کا چہرہ پیلا سا پڑ گیا۔ شہناز لاپرواہی سے گویا ہوئی۔ "زاہدہ! اب اس کی فکر نہ کرو۔ بیچارے کو کوئی چکوری مل گئی ہو گی۔ ہر کوئی اپنی جنس سے لگاؤ رکھتا ہے۔ جانور جانور کے ساتھ اور پنچھی پنچھی کے ساتھ۔"

ہم مایوس ہو کر موٹر میں بیٹھے۔ میں نے کچھ سوچ کر کہا "زمین کا رشتہ" پہاڑوں کے پیچھے سے چکوروں کا ایک غول فضا میں تیرتا ہوا نظر آیا۔ زاہدہ حسد بھری نظروں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔

غلام ربّانی

طغیانی

اس کی شکستہ جھونپڑی اُس نہر کے اونچے کنارے پہ تھی جو توبہی جنگلات سے گزرتی ہے۔ اس کے چند گدھے ہی اس کی کُل پونجی تھے جنہیں لے کر وہ پو پھٹتے ہی کسی خشک جھیلے کا رخ کرتا۔ شام کو اس کی واپسی کا وقت وہی تھا جب عورتیں اپنے ڈھور ڈنگر لے کر گھروں کو لوٹ آتیں۔ یہی ان کی بود و باش تھی اور یہی ان کا روزگار۔ ان کو تقدیر سے کوئی گلہ شکوہ نہ تھا۔ سال کے بارہ مہینے اسی طرح گذرتے مگر جب برسات کے دنوں میں سیلاب آجاتا تو ان کے دلوں میں ہزاروں وسوسے جنم لینے لگتے۔ عام حالات میں تو سیلاب آکر خاموشی سے گزر جاتا مگر جب کبھی سیلاب کی شدت ان کو اپنے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیتی تو علیسی کو بیوی بچوں سمیت کسی خشک اور نسبتاً محفوظ علاقے کی طرف جانا پڑتا جہاں مہینے دو مہینے تک وہ اپنے گھر لوٹنے کا انتظار کرتا رہتا۔

یہ توبہی کے جنگلات کی گنجانی کا یہ عالم کہ ہوا بھی اُدھر جاتے ہوئے گھبراتی ہے پھر مچھر تو بس خدا کی پناہ۔ موٹے موٹے اور بڑے بڑے مچھر راتوں کو مل کر جب اپنی تانیں چھیڑتے ہیں تو سارا جنگل گونجنے لگتا ہے بھن بھن بھن بھن . . . . . لیکن یہاں کے باسی پھر بھی اپنے حالات پہ قانع تھے۔ ہوتا یہ کہ علیسی رات کو سونے سے پہلے اُپلوں کا ایک ڈھیر لگاتا اور اس میں چنگاری رکھ دیتا گویا اپلوں کے بدبودار دھوئیں سے مچھروں کے خلاف دفاعی جنگ لڑی جاتی اور اس طرح دھوئیں کی ملگجی فضاؤں میں سب سُکھ کی نیند سوتے اور رات کٹ جاتی۔

کیڑے مکوڑوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔ اندھیری رات میں باہر قدم رکھنا موت کو دعوت دینا تھا۔ سانپ کے کاٹے کا علاج خاص گھریلو اور دیسی طریقے سے کیا جاتا۔ جس جگہ سانپ کاٹتا اس جگہ کو نشتر سے خوب کھرچ کر پسی ہوئی سرخ مرچیں بچھا دی جاتیں پھر تمباکو کے پتے لپیٹ کر مٹی کا تیل چھڑکا جاتا اور اللہ کا نام لے کر خوب کس کر پٹی باندھ دی جاتی اس کے بعد گائے کے تازہ اور گرم دودھ کا ایک بڑا پیالہ پینا پڑتا۔ صبح کو جب آنکھ کھلتی تو زہر کا ذرا سا بھی اثر باقی نہ رہتا۔

جنگل کی زندگی کے یہ نشیب و فراز ان کی زندگیوں میں رچ بس گئے تھے ہاں خوف تھا تو بس سیلاب کا جو برسات کے موسم میں بلائے ناگہانی کی طرح چڑھ آتا۔ ادھر مچھیرے پوری قوت سے انسانوں کی اس آبادی پر دھاوا بول دیتے۔ نہ صرف جنگل بلکہ قرب و جوار کے علاقوں سے بھی مچھیرے اس خطے کا رُخ کرتے۔ گھر گھر بیر یا بھیل جاتا تو عیسیٰ چند مچھلیوں کے عوض گاؤں کے حکیم خوشی محمد سے کونین کی چند گولیاں لے آتا۔ عیسیٰ کی جھونپڑی اور گاؤں کے درمیان بس ایک ڈیم ہی تو حائل تھا جو سیلاب کی روک تھام کے لئے بنایا گیا تھا۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی دریا کی موجوں میں سیلابی کیفیت تھی لیکن سیلاب نے جو قیامت ڈھائی تھی اسے دیکھ کر بوڑھے مچھیرے اپنی داڑھیوں پر ہاتھ پھیر پھیر کے قسم کھا رہے تھے کہ ایسی طغیانی انہوں نے زندگی بھر نہ دیکھی تھی۔ عیسیٰ بیحد مضطرب تھا۔ آخر کیوں نہ ہوتا پانی صرف دو ہی دن میں سارے ڈیلٹا کو عبور کر کے اچھلتا کودتا اس مقام تک آ پہنچا تھا۔ جہاں تین مختلف سڑکوں کا سنگم تھا۔

سیلاب کا زور بڑھنے سے مچھروں کی افزائش میں بھی بلا کا اضافہ ہوا تھا۔ عیسیٰ کی دونوں بچیاں بخار میں پھنک رہی تھیں وہ حسب معمول مچھلیوں کی ٹوکری تھامے حکیم خوشی محمدؐ کے پاس پہنچا۔ گاؤں کے حکیم نے سیلاب کی کیفیت پوچھی اور کہا "کیوں بھائی عیسیٰ کیا خیال ہے تیرا میں نے جو مٹر کی فصل ڈیم کے اس کے پار لگا رکھی ہے بھلا وہ اس سیلاب سے بچ بھی سکے گی؟" —— "وہ حکیم جی! سنا تو یہی ہے کہ اس سال پانی ٹوٹنے کو نہیں آیا۔ اللہ رحم کرے اس بار بڑی بربادی ہے۔ میں ابھی ابھی دیکھ کر آ رہا ہوں کہ ڈیم پر سب بابو لوگ پریشانی کی حالت میں ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں آخر خطرہ بڑا ہی ہوگا نا؟"... —— "تیری طرف کا کنارا تو پھر آن کی آن میں ڈھے جائے گا۔ میری مان۔ بس اب تو اپنے بیوی بچوں کو لے کر ادھر آجا اور کچھ دن ہمارے پاس رہ لے۔"

"بڑی مہربانی آپ کی۔ بس جی میں تو رب سے لو لگائے بیٹھا ہوں وہی بھلی کرے گا۔ اگر خطرہ زیادہ ہوا پھر تو ضرور آنا پڑے گا۔ خدا تمھیں سکھی رکھے حکیم جی!" —— "خیر خیر اب ایسا بھی کیا۔ اللہ کی ذات سے بھلی اُمید رکھنی چاہیے۔ اللہ سب پر کرم کرے اور ہاں سن واپسی میں تو رئیس خان محمد کی زمینوں سے تو گزرے ہی گا وڈیرے سے میری بڑی یاری ہے اگر تجھے

نظر پڑے تو کہیو کہ میں اس کی طرف سے بڑا فکر مند ہوں۔"

"حکیم جی! میں تو اللہ لگتی کہوں گا۔ اس علاقے سے میں ذرا بچ کر ہی چلتا ہوں۔ بُرا نہ ماننا سائیں! وڈیرہ بھی کوئی انسان ہے؟ غریبوں کا تو جانی دشمن ہے۔ مجھے اپنے پاک کلمے لا الہ اللہ محمد رسول اللہ کی قسم انسانیت نام کی تو کوئی چیز اس کے پاس ہے ہی نہیں۔ زیادہ دور کیوں جاؤں۔ ابھی کچھ دن پہلے اس نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کے کھیتوں میں کھاد ڈال دوں۔ پورے پانچ دن میں خوشی خوشی گدھے ڈھوتا رہا کہ اچھی مزدوری ملے گی لیکن حکیم جی! یقین کرنا وڈیرے نے تو بس دو جملوں میں میرا سارا احساب چکا دیا کہنے لگا واہ بھئی واہ کام بالکل ٹھیک کیا ہے تو نے جا عیش کر۔ میں تو گم سُم رہ گیا تھا۔ ہم لوگ محنت مزدوری کرتے ہیں بال بچوں کا پیٹ پالنے کو اگر اس طرح بیگار ڈھونے لگیں تو نا تو مر جائیں یہ ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے وڈیرے کو روپے پیسے کی کیا کمی لیکن اس نے تو . . . . "

"ارے بادشاہ لوگ ہیں۔" حکیم جی نے ٹوکا "ایسا ہو جاتا ہے لیکن تجھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے وہ تیرے علاقے کا بڑا آدمی ہے اور تو اس کی پناہ میں ہے" ——"ہونہہ اس پاپی کی پناہ میں؟ میں تو اس سخی داتا کی پناہ میں ہوں جو مکار کوتوں کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔ میں تو اپنی محنت کی روزی پر زندہ ہوں حکیم جی! خیر۔ لو اب میں چلا۔" بسم اللہ کہہ کر علیسی اٹھ گیا حکیم جی نے اسے خوش رہنے کی دعا دی اور علیسی حکیم جی کے پیر چھوتا ہوا اپنے گدھے پر سوار ہو گیا۔ وڈیرے کی طرف جانے کا خیال بھی دماغ سے نکال دیا۔ "بد سے خدا بچائے اس نے سوچا——

گھر پہنچتے ہی اس کی بیوی نے بڑی پریشانی کے عالم میں اسے بتایا کہ سیلاب صرف آدھ میل کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔ اب تو واقعی علیسی کو بڑی تشویش ہوئی خطرہ بہت قریب آ گیا تھا۔ مٹی کا بنا ہوا ندی کا کنارہ لاکھ اونچا سہی مگر سیلاب کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ کسی بھی لمحے ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ سکتا ہے۔ علیسی کی بیوی نے بھی اس خیال کو تقویت دی کہ انھیں اب یہ جگہ چھوڑ دینا چاہیے۔ جب ببول کے پرانے درخت دھڑا دھڑ گر رہے تھے تو پھر ندی کا کنارہ کب تک؟

عیلسی کو پو پھٹتے ہی یہ کام کرنا تھا کہ گاؤں جا کر سب سے پہلے مکان کی بات کرے۔ تمام رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ مچھروں نے کاٹ کاٹ کر سب کا برا حال کر دیا۔ بخار میں بھنتے بچے رات بھر بڑبڑاتے رہے۔ ہوا میں درختوں کے گرنے کا شور تھا یا لہروں کے غرانے کا۔ مویشی ڈوب رہے تھے اور ان کی دردناک چیخیں دل ہلائے دیتی تھیں پھر آسمان سے اچانک ٹپا ٹپ بوندیں گرنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ سیلاب نے کچھ اور شدت اختیار کر لی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سیلاب کے خوفناک پنجوں سے کوئی نہ بچ سکے گا اور سب کچھ بہہ جائیگا۔

صبح ہوتے ہی جب بارش ذرا تھمی تو عیلسی اپنی جھونپڑی سے نکلا۔ باہر ہر طرف پانی کے جھاگ کی حکمرانی تھی۔ تھپیڑے مارتی ہوئی موجیں ہر طرف سے لپکی چلی آ رہی تھیں ...... صرف ایک رات میں پانی اتنا چڑھ آیا تھا کہ اب امیدوں کا سہارا بیکار تھا۔ عیلسی لپک کر اپنے گدھے پر سوار ہو گیا باقی گدھوں کو بھی اس نے کھول دیا۔ تیزی سے گدھا دوڑاتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کی پکار سنی "ہم تباہی کے منہ میں بیٹھے ہیں جلدی آنا"۔ عیلسی نے چیخ کر جواب دیا "فکر مت کر بس ابھی آیا میں ایک منٹ میں"۔

گدھوں کی آدھی آدھی ٹانگیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ بمشکل چھپڑ چھپڑ کرتے جنگل کے حصار سے نکلے راستے میں عیلسی کو خیال آیا کہ حکیم جی نے اسے وڈیرے کی طرف جانے کو کہا تھا تو اس نے صاف جواب دے دیا تھا مگر اب وہ خود حکیم جی سے مدد مانگنے جا رہا ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ پہلے ان کا حکم پورا کرے۔ اس کام میں زیادہ دیر لگنے کا احتمال بھی نہ تھا۔ چنانچہ وہ تیزی سے وڈیرے کی طرف مڑ گیا جہاں لوگوں کا بڑا ہجوم تھا اور بہت سے لوگ ہاتھوں میں کدالیں اور پھاوڑے لئے جلدی جلدی بند باندھنے میں مصروف تھے۔

جوں ہی وڈیرے کی نظر عیلسی پر پڑی وہ وہیں کھڑے کھڑے چلایا "شاباش جوان بڑے ٹھیک وقت پر آیا۔ میرے پاس آدمیوں کی کمی بھی ہے اور گدھوں کی ضرورت بھی۔ بس فٹافٹ جت جا کام میں۔ سیلاب بس آنے ہی والا ہے۔ یہ بند فوراً مکمل ہو جانا چاہیے"۔ وڈیرہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

عیلسی کا خون خشک ہو گیا۔ یوں لگا کہ جیسے سوکھے پتے کی طرح زمین پر گرنے ہی والا ہے اس

کی بدقسمتی اُسے اُدھر کھینچ لائی تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ سیلاب ابھی اس جگہ سے بہت دور ہے اور اس کے بیوی بچے تو سیلاب کے منہ تک پہنچ چکے ہیں مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اسے معلوم تھا کہ وڈیرے کے دل میں انسانیت اور ہمدردی کہاں؟ وہ کسی کی مجبوری کو کیا سمجھے۔ علیسی کو خاموش اور بے بس حرکت دیکھ کر وڈیرہ بڑے خوفناک انداز میں گرجا۔" او کاہل کُتے! سوچ کیا رہا ہے؟ جلدی کر کیا تجھے اتنی بھی عقل نہیں کہ ہم ایک ایسے سیلاب کا مقابلہ کر رہے ہیں جو کسی بھی لمحے آنے والا ہے۔"

علیسی نے وڈیرے کے تیور دیکھ کر خاموشی سے مٹی ڈھونے کا کام شروع کر دیا مگر وہ اپنے بوجھل اور مغموم دل سے بیوی بچوں کا خیال نہ نکال سکا۔ اس کی آہ و بکا بھلا کون سُنتا۔ وڈیرے کی جابرانہ حکومت میں وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ دوپہر کے وقت ذرا سی مہلت ملی تو وہ فورمین کے پاس گیا تاکہ اسے اپنی بے بسی کی داستان سنا سکے وہ گڑگڑانے لگا مگر فورمین نے بڑی بے پروائی سے اُسے جھڑک دیا۔ "وڈیرہ صاحب کی مرضی اور اجازت کے بغیر ایک آدمی بھی یہاں سے نہیں ہل سکتا۔ جب تک یہ بند کمر تک اونچا نہ ہو جائے کسی شخص کو جانے کی اجازت نہیں جا اور بے کار وقت ضائع نہ کر۔" "لیکن سرکار! ......" علیسی نے کچھ کہنا چاہا۔" بند کر یہ بکواس کیوں اپنی قضا کو بلاتا ہے۔ جو تجھ سے کہا جا رہا ہے وہی کر۔"

شام ہو گئی مگر بند صرف گھٹنوں تک ہی اونچا ہو سکا۔ علیسی کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ اس کی روح جھونپڑی پر منڈلا رہی تھی اس نے سوچا اگر کام کی یہی رفتار رہی تو ساری رات مٹی ڈھوتے گزر جائے گی۔ مجھے کسی نہ کسی طرح یہاں سے کھسک جانا چاہیے خدا جانے میرے معصوم بچوں کا کیا بنا ہو گا۔ بچوں کا خیال آتے ہی وہ تڑپ گیا اب گدھوں کی پروا کئے بغیر وہ ایک ہی جست میں بند کے اس پار تھا۔

فورمین نے جو اسے کودتے دیکھا تو چلایا۔" ابے او! کدھر جاتا ہے۔"

"ابھی آیا پیشاب کر کے۔" علیسی نے بیٹھ کر آگے کھسکتے ہوئے خوفزدہ سی آواز میں کہا۔ "پیشاب پاخانہ اِدھر ہی کر لے اُن جھاڑیوں میں اتنی دور کیوں جا رہا ہے واپس آ فوراً۔" فورمین پاگلوں کی طرح چیخا۔ شاید وہ تاڑ گیا تھا کہ علیسی راہِ فرار اختیار کر رہا ہے۔ علیسی نے پلٹ کر دیکھا اور ایک دم کھڑا ہو کر بھاگنے لگا۔ فورمین نے اس کے پیچھے آدمی دوڑائے لیکن علیسی اپنی جان بچانے کیلئے پوری قوت سے بھاگ رہا تھا۔ اندھیرے نے پورے علاقے کو نگل لیا۔ تمام راستے پانی میں ڈوب چکے تھے علیسی اپنی سمت کا

تعین نہ کر سکا مگر اندھا دھند بڑھتا رہا اسے تو بس ایک ہی دُھن تھی کہ کسی طرح نہر کے کنارے پہنچ جائے۔ بارش پھر سے ہونے لگی تھی مگر عیلسی نہ رکا۔ جنگلی جانوروں کی چیخ پکار سے تمام جنگل گونج رہا تھا۔ ہوا، پانی اور بارش کے شور سے بوجھل تھی۔ گیدڑ رو رہے تھے۔ درختوں کے ٹوٹنے اور بادلوں کے گرجنے کی آوازوں سے ماحول پر عجیب ہیبت طاری تھی مگر یہ شور، یہ ہنگامہ اور یہ ہیبت بھی عیلسی کے حوصلے پست نہ کر سکی اسے ایک منٹ میں لوٹنے کا وعدہ بُری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ موجیں مارتا ہُوا پانی اُسے کمر تک جکڑے ہوئے تھا۔ پھر بھی وہ بڑھتا رہا بڑھتا رہا اب بُوٹوں کے جانے پہچانے جھنڈ صاف نظر آنے لگے تھے لیکن یہ جُھنڈ تو نہر کے عین کنارے سے شروع ہوتے تھے۔ یہ سوچ کر اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں بھیانک اندھیرا سا چھا گیا۔ نہر کا کنارا کہیں دور دور تک نظر نہ آیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا خلاؤں میں کچھ ڈھونڈتا رہا۔ لہریں بڑھ بڑھ کر اس کی چھاتی تک آگئیں۔ بارش اس کے چہرے سے پھسل پھسل کر پانی میں گم ہو رہی مگر اس کی آنکھیں سُوکھی تھیں۔

اچانک عیلسی نے دیکھا کہ ایک سفید سی شے اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وہ اسے حیرت سے دیکھتا رہا اور جب وہ بالکل قریب آگئی تو عیلسی نے لپک کر اسے اُٹھا لیا۔ ارے یہ تو اس کا مُوتی تھا۔ وفادار مُوتی — مالک کو دیکھ کر مُوتی رونے لگا جیسے وہ رو رو کر یہ پوچھ رہا ہو۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟ تم نے اتنی دیر کیوں لگا دی؟ کہاں گئے تھے؟ کہاں؟ کہاں؟"

پھر دفعتاً بڑھتی ہوئی موجوں اور برستی ہوئی بارش کے ساتھ ساتھ عیلسی کی آنکھیں بھی برسنے لگیں جیسے بند اب ٹوٹا ہو طغیانی اب آئی ہو۔

جمال ابڑو

پیرانی

بروہی قوم کا ایک کنبہ چھوٹے سے قافلے کی صورت میں جانوروں پر اسباب لاد کر پہاڑی سے اتر رہا تھا۔ جاڑوں کا آغاز تھا۔ چٹیل پہاڑیوں سے خشک اور تیز ہوائیں چھوٹی چھوٹی کنکریاں ڈھکیلتی جا رہی تھیں۔ دو تین بیل تھے جن کی پیٹھ پر اسباب لدا ہوا تھا۔ ایک اونٹ پر لمبے بانس اور موٹے شہتیر لدے ہوئے تھے جو سندھ میں فروخت کرنے کی غرض سے لے جائے جا رہے تھے۔ مردوں کے پاؤں ننگے شلواریں پھٹی ہوئی اور ٹخنوں سے اوپر تھیں سروں پر کشیدہ کٹے ہوئے میلے اور بوسیدہ ٹوپے جن پر کانچ کے چھوٹے چھوٹے گول ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ بال لمبے خشک اور میل سے بھرے ہوئے۔ عورتیں اپنی کشیدہ کاری کی خوبصورتی سے مزین لمبے کرتے زیب تن کئے ہوئے تھیں۔ بیلوں پر پڑی ہوئی جھولیں کسی ہوئی تھیں جن میں بکری کے اون سے بنے ہوئے رسے پڑے تھے۔ چھوٹے بچے بیلوں پر سوار تھے بڑوں کے ہاتھوں میں پتلی پتلی چھڑیاں تھیں جن سے وہ بیلوں کو ہانک رہے تھے اور منہ سے ہے ..... ہوں۔ ہوں ..... کی سریلی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ سب شکل و صورت سے دل آویز تھے اور ان کے اعضا متناسب۔

ایک جگہہ دوپہر کو یہ مختصر سا قافلہ آ کر رکا۔ بغچے میں حفاظت سے رکھی ہوئی سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے سب میں تقسیم کر دیے گئے۔ دوسرے بغچے سے پنیر کے خشک ٹکڑے نکال کر پانی سے بھرے ہوئے ایک برتن میں ڈال دیے گئے جس سے سب نے دو تین گھونٹ باری باری پیئے۔ نو برس کی معصوم سی پیرانی نے خوش ہوتے ہوئے کہا "سندھ میں بہت سی اچھی اچھی چیزیں ہیں" اس کے باپ نے ٹوپا اتار کر سر کھجایا۔ ماں نے خفا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ دوسرے بچوں کی آنکھوں میں میٹھی میٹھی چیزوں کا نظارہ گھومنے لگا۔

وہ سندھ میں دھان کی گھاس سے بنی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے، گھاس پر سوتے اور گھاس ہی کے جوتے بنا کر پہنتے۔ انہوں نے بانس بیچے، بکری کا اون فروخت کیا فصل کاٹنے کی مزدوری کی اور پھاوڑے چلائے۔ سردی کا موسم ختم ہوتے ہی انہوں نے واپسی کی تیاری کی لیکن بچوں

کو کھانے کی میٹھی چیزیں نہیں ملیں۔

روانگی سے پہلے پیرآنی کے باپ نے گھر والی کا چہرہ دیکھا اس کے سامنے ویرانی اور بھوک کا نقشہ پھر گیا۔ ماں نے مایوس ہو کر پیرآنی کے کرتے پر نظر ڈالی جو اس نے ابھی دھو کر سکھانے ڈال دیا تھا۔ اس کی خاموش اور بے بس آنکھوں میں انکار تھا۔

پیرآنی کا باپ قریبی گاؤں میں گیا "سلاما لیک" کہا اور پوچھا "لڑکی چاہیئے بھائی!" باپ کا مقصد اپنی بیٹی کو فروخت کرنا تھا۔ سندھ میں عورتوں کی قلّت۔ جانے کتنے نوجوانوں نے منت مانگی ہوئی تھی "خدا کرے سب کی آس پوری ہو۔"

لاکو کے باپ نے بیٹے کو دیکھا۔ مونچھوں کا سبزہ چہرے پر ظاہر ہو رہا تھا پھٹی پھٹی سی آواز۔ ڈاڑھی کے دو چار بال بھی کہیں کہیں اُگ آئے تھے۔ دونوں بروہی کے ساتھ گئے۔ بروہیوں کے کتے سندھیوں کو دیکھ کر پاگل سے ہو کر زور زور سے بھونکنے لگے۔ پیرآنی ننگی پیٹھ کھلے ہوئے بال حواس باختہ ہو کر دوڑی اور اپنی ماں کے دامن کو پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔۔۔ لاکو نے ہاتھ لگا کر اسے دیکھا۔۔۔ پیرآنی کے باپ نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "ضعیف نہیں ہے۔" کتّوں نے بھونکنا چھوڑ دیا گاؤں سے دور تک بھاگتے آئے اور ان کو گاؤں سے باہر نکال کر دُم ہلانے لگے پھر جسم کو زور سے جھاڑ کر اِدھر اُدھر نکل گئے۔ انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔

گاؤں کے باہر ساٹھ روپیہ پر سودا طے ہوا۔ آج بروہیوں نے اپنا ڈیرا اٹھایا اسباب باندھ کر بیلوں پر لادا گیا بچّے اپنے گاؤں کی باتیں کرنے لگے۔ پہاڑی کی اور پہاڑی بیریوں کی۔

لاکو کا گاؤں راستے میں پڑتا تھا۔ پیرآنی کی ماں بالکل پیرآنی کے پہلو بہ پہلو چل رہی تھی۔ باپ نے بھی اس کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ پیرآنی نے پوچھا "ابّا اب ہم اپنے وطن جا رہے ہیں۔" باپ نے گردن ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہا تھا۔ ماں نے محسوس کیا کہ کوئی بڑی سی چیز اس کے سینے میں اٹک گئی ہے جو باہر نکلنے کے لئے بیتاب ہے۔

لاکو کے گاؤں والے پہلے سے وہاں کھڑے تھے۔ ماں نے لپک کر پیرآنی کو گود میں

اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ ماں اور بیٹی کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے باپ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پیرآنی کا بازو چھڑایا۔ ماں کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ دل نے دہائی دی "ہائے ہائے میری معصوم پیرآنی"۔

پیرآنی نے دفعتاً ایسی دلخراش چیخ ماری کہ آس پاس کے درختوں پر بیٹھے پرندے چونک کر اڑ گئے۔

زمین پر پڑی ہوئی پیرآنی کو لاتو کے باپ نے پکڑا۔ پیرآنی کے باپ کے آنسو اس کی ڈاڑھی سے ٹپک رہے تھے اور وہ تڑپتی ہوئی گھروالی کو گریہ وزاری سے روک رہا تھا۔

قافلہ روانہ ہوا۔ پیرآنی کی گگھی بندھ گئی اس نے رندھی ہوئی آواز میں پکارا "ابا ابا — اماں۔ اماں"۔

ماں اور باپ کے قدم شدت غم سے من من بھر کے ہو گئے تھے۔ دور سے آواز آتی رہی "او خدا! میری معصوم پیرآنی۔ ہائے پہاڑی کو آگ لگے۔ سندھ آباد ہو — میری معصوم پیرآنی"۔ پیرآنی کی ماں اپنے بال نوچ رہی تھی۔

لاتو اور اس کے ساتھی تڑپتی ہوئی پیرآنی کو گھیرے رہے۔ وہ بل کھاتی، ایڑیاں رگڑتی اور ان کے چنگل سے چھوٹ کر بھاگنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ لاتو دوڑ کر کھانے کی میٹھی چیزیں لے آیا جوں توں کر کے اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا لیکن قند کی ہر ڈلی منہ سے نکل کر دور جا پڑی۔ نرم و نازک گلے سے گھٹی گھٹی آوازیں آنے لگیں۔ لمبی سانسوں اور ہچکیوں میں ابا..... اماں کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ دور جانے والوں کو پکارتے رہے لیکن کسی نے بھی اس کی پکار کا جواب نہ دیا۔

لاتو کے تن من میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ بھاگ کر گھر سے چھری لے آیا اور قہر آلودہ آنکھوں سے پیرآنی کو گھورتے ہوئے گرجا "بس کرو نہیں تو جان سے مار دوں گا"۔

مٹی میں لت پت پیرآنی نے رہی سہی طاقت سے چیخ ماری۔ بھاگل نے معصوم بچی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ بکری کان کھڑے کر کے چلائی اور اپنے بچے کو چاٹنے لگی۔

پیرآنی آج بھی زندہ ہے اس کا ایک بیٹا پولیس میں ہے اور دوسرا جیل میں۔

ایاز قادری

بلّو دادا

وہ پورے محلّے میں بدنام تھا۔ ہر ایک اس سے خوف کھاتا اور محلے کا ہر کس و ناکس اس کا نام سن کر ہی لرز جاتا۔ مالدار لوگ اسے غنڈہ سمجھتے تھے اور بڑا دادا گیر جانتے ہوئے محلّے کے دوسرے افراد بھی اس سے سہمے رہتے تھے۔

نام تو اس کا بلاول تھا لیکن عام طور وہ بلو دادا کے نام ہی سے پکارا جاتا۔ گہرا کالا رنگ، چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے مگر سخت بال جو تیل ڈالنے کے باوجود نرم نہ ہوتے اور نہ کنگھا کرنے سے کسی صورت بیٹھتے۔ کشادہ اور گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں مگر بے چین اور شرارت سے بھرپور، چھوٹی ناک بڑے بڑے نتھنے، موٹے موٹے ہونٹ، مضبوط دانت جو مسواک کرنے سے چمکنے لگتے مگر ہونٹوں کا سیاہ رنگ کچھ اور گہرا ہو جاتا۔ پان کھاتا تو دانتوں اور ہونٹوں کا رنگ ایک جیسا ہو جاتا۔ بازو سخت اور مضبوط، سینہ بھرا ابھرا اور کافی کشادہ، چھوٹا قد لیکن ایسا مرعوب کُن کہ جب وہ غصّے سے کسی کی طرف گھورتا تو اس کی سٹی گم ہو جاتی۔ آواز میں وہ گھن گرج کہ جب وہ باتیں کرتا تو معلوم ہوتا جیسے کالے کالے گھنے بادل زور زور سے گرج رہے ہوں۔ کھیل کود کا شوقین، فٹ بال کا چیمپئن۔ زیادہ تر میچوں میں وہ سینٹر فارورڈ کی جگہ پر کھیلتا۔ باکسنگ کا ایسا رسیا کہ اکثر یہ دعویٰ کرتا کہ کون ہے جو میرے تابڑ توڑ مکّوں کی تاب لا سکے۔

میری جان پہچان اس سے چاکیواڑہ میں ہوئی وہ زیادہ تر جھانگیاں مکرانی کے کیبن پر بیٹھا ہوا ملتا۔ اس کے سامنے بوسیدہ سی میز پر ہمیشہ میں نے پانی کا گلاس اور چائے کا کوپ رکھا دیکھا کبھی خالی اور کبھی بھرا ہوا۔ میں اُدھر سے گزرتا تو وہ بڑے تپاک سے آواز دیتا۔ "ماسٹر! آؤ چائے پیو۔" وہ مجھے کبھی "سائیں" اور کبھی "ماسٹر" کہہ کر مخاطب کرتا۔ آہستہ آہستہ ہمارے تعلقات بڑھتے گئے۔ مجھے اس کا مکرانی آمیز سندھی لہجہ بہت اچھا لگتا تھا اور میں اکثر یہ خواہش رکھتا تھا کہ وہ اس لہجے میں اپنی کوئی داستان سنائے۔ میں اس کے قریب ہوتا تو وہ بات بات پر اپنا ہاتھ

بڑے پیار سے میرے ہات پر مارا کرتا۔

میرے دوستوں کو یہ سنگت بھلی نہ معلوم ہوتی۔ محلے والے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے، عزیز و اقارب ناراض رہتے، اسکول کے اساتذہ بھی کھنچے کھنچے رہتے اور میری اس دوستی کو پسند نہ کرتے۔ رہے میرے شاگرد تو وہ مجھ سے الگ تھلگ تو رہتے البتہ بلو کی داداگیری کی داستان بڑھا چڑھا کر بیان کیا کرتے۔

ایک دن اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے مجھے بلا کر خاص طور پر یہ سمجھایا کہ "تمھیں اپنے جیسے تعلیم یافتہ افراد کی صحبت اختیار کرنا چاہئیے۔"

گھر والوں نے بار بار لعن طعن کرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں دوستی کرنے کو دوسرا کوئی آدمی ہی نہیں ملتا جو ایسے آوارہ، بدمعاش اور ٹچے لفنگے سے یارانہ گانٹھا ہے۔" ادھر دوستوں نے دھمکی دی۔ "دیکھو جی! اگر تم اس غنڈے کی سنگت میں رہنا پسند کرتے ہو تو پھر ہم سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔"

میں سب کی سنتا رہا لیکن پروا کسی کی نہ کی آخر دوستی تھی کوئی مذاق نہیں۔ سب خلاف ہیں تو ہوا کریں ایک مرتبہ جو میں چاکیواڑہ کی طرف گیا تو دیکھا کہ بڑا مجمع ہے۔ آدمیوں کے اس ہجوم میں بلو کی تیز تیز گالیاں سنائی دیں۔ میں نے سمجھا کہ آج خیر نہیں خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ میں اس بھیڑ بھاڑ میں گھس کر آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں ایک کار کھڑی تھی اور اس کے آگے بلو ایک موٹے سیٹھ کو گردن سے پکڑے بیٹھا تھا۔ "سالا حرامی! جو تجھے کار نہیں چلانا آتی تو چلاتا کیوں ہے؟ کیا تم سیٹھ لوگ دنیا کے نشے میں اتنے اندھے ہو گئے ہو کہ اپنی آنکھیں پھوڑ کر غریبوں کے سروں پہ موٹریں چڑھاتے پھرتے ہو۔"

میں نے آگے بڑھ کر بمشکل تمام بلو کو ایک طرف کیا اور اصل واقعے کی تفصیل پوچھنے لگا۔ "سائیں! دیکھو یہ حرام خور کتنی لاپرواہی سے کار چلاتا ہے۔ غریب بچی کا سر کچل دیا اور اسکو اسپتال لیجانے کی بجائے اپنی کار کو بچا کر بھاگنا چاہتا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار مکا اس کار والے کے رسید کرنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ روک لیا اور اس کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اب اس نے سیٹھ کو قدرے دھیمے انداز میں ڈانٹا۔ "بے چل اس بچی کو اسپتال اور......"

اس نے زخمی لڑکی کو بڑی احتیاط سے اٹھا کر کار میں سوار کیا۔ مجھے اپنے ساتھ لیا اور سیدھا

اسپتال پہنچا۔ وہاں کے سارے اخراجات سیٹھ سے دلوائے پچاس روپیے الگ سے اس کے اوپری خرچ کے لئے نکلوائے تب کہیں اس کار والے کی جان چھوڑی ۔

ایک دن جب میں اسکول گیا تو لڑکوں نے مجھے بتایا کہ " سائیں! رات ہمارے محلّے میں بڑا جھگڑا ہوا۔" میں نے پوچھا۔" وہ کیسے ؟" — بولے۔" بلّو دادا نے تین چار شریفوں کو گھیر کے خوب مار لگائی۔ خون خرابا تو نہ ہوا بس ان سب کو اَدھ مُوا کر کے چھوڑ دیا ۔"

یہ سن کر میں لڑکوں کو پڑھانا تو بھول گیا اور غور کرنے لگا خدا جانے رات کیا حادثہ پیش آیا ہو؟ اسی اودھیڑ بن میں اسکول کا وقت ختم ہو گیا چھٹی ہوتے ہی میں چھانگیاں کے کیبن کی طرف چلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بلّو آنکھیں سُوجائے بیٹھا ہے ۔ میں اس کے نزدیک جا کر بیٹھ گیا اور اس نے حسب معمول چائے کا آرڈر دیا۔" میں تمہاری چائے نہیں پیوں گا۔" میں نے ٹوکا۔

" آخر کیوں ؟"

" تم نے کتنی بار مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اب دادا گیری نہیں کرو گے مگر ...... "

" سائیں! پہلے پوری بات تو سنو۔ رات کیا ہوا کہ تین سوٹٹ بوٹٹ حرام زادے اپنے اس محلّے کی لڑکیوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ بھلا سائیں! تم ہی بتاؤ بلّو ایسے وقت چُپ ہو کے بیٹھ جاتا کیا ؟ دو تین تھپڑ مار کے سالوں کو سیدھا کر دیا ۔"

ایک دفعہ ملیر سے ایک دوست کی شادی کی دعوت ملی۔ بلّو دادا سے میں نے کہا کہ ساتھ چلیں گے ۔ پروگرام بنایا کہ اتوار کو دس بجے لی مارکٹ سے ملیر کی بس پکڑیں گے ۔

اس پروگرام کے مطابق اتوار کو ہم دونوں بالکل تیار ہو کر نکلے لیکن ابھی چاکیواڑہ سے سو قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ ایک جگہ کسی مسکین کی لاش نظر آئی ۔ ہم سمجھے کہ کوئی غریب پردیسی بیمار ہو کر پڑا ہے جسے رات کی سخت سردی نے بے سُدھ کر دیا ہے ۔ بلّو دادا تیزی سے آگے بڑھا اور اس لاوارث لاش کو ٹٹول کر کہنے لگا۔" سالے کو یہاں آج ہی مرنا تھا۔" پھر کچھ رک کر بڑبڑایا۔" سائیں! اب اس کو ٹھکانے لگاؤں ۔" میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بڑے ناصحانہ انداز میں بولا۔" کسی کی شادی میں جانے کی بجائے ایسے مسکین کی میت اُٹھانا زیادہ بھلا ہے ۔" میں چُپ کر کے بیٹھ گیا پھر کچھ سوچ کر ایک بگھی والے کو بلایا جس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ اپنی بگھی میں لاش کو نہیں لے جائے گا۔

اب بھلا بُلّو کو کہاں برداشت، گریبان پکڑ کر بگھی والے کو نیچے گھسیٹ لیا اور دو چار سخت قسم کی گالیاں سنائیں بس پھر کیا تھا اس بیچارے کی حالت غیر ہو گئی بھیگی بلی بن کر بُلّو دادا کے اشاروں پر ناچنے لگا۔

لاش کو بگھی میں ڈال کر ہم لوگ ایک قریب کی مسجد میں پہنچے۔ بُلّو کی جیب خالی تھی اور میرے لئے بھی مہینے کی آخری تاریخیں۔ کفن دفن کا خرچ کہاں سے پورا ہوتا۔

"بُلّو! اب کیا ہو گا؟"

"سائیں! یہ بلیک مارکیٹیر"۔ سیمنٹ کی عالیشان بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔" ہمارے پیسوں ہی سے شاہوکار ہوا ہے۔ آج ہماری موت پر اسے پیسے دینے ہی ہوں گے۔"

مجھے لاش کے پاس بٹھا کر وہ بڑی دلیری سے اس بلڈنگ میں گھس گیا اور تھوڑی دیر کے بعد فاتحانہ انداز سے لوٹ آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں دس دس روپیے کے کئی نوٹ تھے اور دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو۔

"ارے! یہ کیا؟"

"سائیں! پہلے تو میں نے سیدھے سیدھے کچھ پیسے مانگے۔ سالا ٹال مٹول کرنے لگا مگر اس کو دیکھ کر ہوا یار ہو گئی۔" اس نے کھلے ہوئے چاقو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں۔ میں گاؤں چلا گیا۔ چھٹیوں کے بعد جب کراچی پہنچا تو بُلّو سے ملنے کی دھن سمائی۔

میں فرصت پاتے ہی جھانگیاں کے کیبن پر گیا لیکن بُلّو کو وہاں نہ پایا۔ جھانگیاں نے مجھے بتایا کہ بُلّو مکران چلا گیا ہے۔

"کیوں؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"سائیں!" جھانگیاں نے سیمنٹ والی بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وضاحت کی۔" سیٹھ صاحب نے بُلّو کو غنڈہ ایکٹ کے تحت شہر سے نکلوا دیا۔"

اور میں سوچنے لگا کہ کیا بُلّو سچ مچ غنڈہ تھا؟

رشید بھٹی (خاکہ)

خُداداد

بات یوں ہے کہ میرا ایک دوست جس نے حال ہی میں بی۔اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا تھا۔ کچھ دنوں سے سی۔ایس۔پی اور پی۔سی۔ایس کے امتحانوں کی تیاری میں مشغول تھا۔ عام واقفیت کی کتابوں کے علاوہ ایک دو انسائیکلوپیڈیا اس کے زیر مطالعہ رہی تھیں۔

اُس بات سے پہلے جس نے میرے دل میں خداداد کی یاد تازہ کی۔ میں آپ کو اپنے اس گریجویٹ دوست کی عام واقفیت کے متعلق معلومات کی ایک دو مثالیں بھی دیتا چلوں۔

پچھلی گرمیوں میں یہ ہمارے ساتھ کوئٹہ گئے۔ ایک دن وہاں کسی باغ میں گھومتے گھامتے میں نے قریب قریب سبھی پیڑ پودوں کے نام بتائے اور جب ہم باغ سے باہر آئے تو میرے دوست نے شکایت کی کہ میں نے اس کو ایک خاص چیز تو دکھائی ہی نہیں۔ میں نے پوچھا۔ "وہ کیا" تو فرمانے لگے۔ "تم نے پورے باغ میں تربوزوں کی بیل تو دکھائی ہی نہیں"۔ یہ تھا میرے دوست کی قابلیت کا عالم جو عام سندھی زبان میں کلکٹری کا امتحان دینے جا رہے تھے۔

ایک دن چائے پیتے ہوئے کہا کہ "مجھ سے کوئی معلوماتی سوال پوچھو"۔ اس کی اس ترغیب پر میرے ایک دوسرے دوست نے سوال کیا "بتاؤ چو این لائی کون ہے؟" اس سوال پر وہ سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد چہک کر بولا "کیوں مذاق کرتے ہو یہ تو کوئی مچھر مارنے والی دوا ہے"

بات تو آئی گئی ہو گئی مگر میرے دل میں ایک پرانے پڑوسی اور دلچسپ شخص کی یاد تازہ کر گئی۔ میں سوچنے لگا کہ جب ہمارے گریجویٹ دوست کا عالم یہ ہے تو بیچارے خداداد پر لعن طعن کیوں جو غریب دو چار جماعتیں بھی پاس نہ تھا۔

خداداد ہمارے محلے میں سیٹھ محمد یوسف میمن کے پاس آتا تھا۔ وہ فرصت کے اوقات میں سیٹھ کے کچھ کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ اُسے سکھر میں آتے ہوئے سال ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا۔ تعلیمی لحاظ

سے بالکل کورا تھا۔ والدین نے اُسے اسکول میں داخل تو کرایا تھا مگر ایک دن جبکہ وہ ابھی
الف، بے ہی پڑھ سکا تھا ماسٹر صاحب نے اسے اپنے لئے ایک آنے کے چنے لانے کو بھیجا۔
اکنّی کہیں گر گئی اور کسی دوسرے کے ہاتھ لگ گئی۔ یہ مار کے خوف سے پھر کبھی اسکول نہ
گیا۔ تھوڑے بہت ہجّے کرنا جو سیکھ چکا تھا ان کی مدد سے شہر میں رہ کر راستوں، دکانوں اور
سینماؤں کے بورڈ پڑھنے میں اسے خاصی مہارت ہو گئی تھی اور اس طرح اسے آسان عبارتوں کا
پڑھنا آ گیا تھا۔

شام کو وہ کام کاج سے فارغ ہو کر محلے کی مسجد کے کنویں پہ آ جاتا جو میرے دروازے
کے قریب ہی تھا اور جہاں ہم لوگ جمع ہو کر مذہبی، سیاسی، سماجی اور ادبی گفتگو کرتے۔ وہ اس گفتگو میں
خود بھی بڑی دلچسپی ظاہر کرتا اور کبھی کبھی " سائیں! گستاخی معاف کرنا" کہہ کر اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتا۔

ایک مرتبہ میرے ایک کامریڈ دوست موجودہ سماج پر گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ اس
وقت مرحوم خداداد وہاں بیٹھا تھا اور غور سے کامریڈ کی تقریر سن رہا تھا اس کو متوجہ دیکھ کر کامریڈ
بھی اسی کو مرکزِ نگاہ بنائے ہوئے تھے اور تقریر طول کھینچتی جا رہی تھی۔ سماجی نظام کے تمام
نشیب و فراز پر جوش و خروش سے نکتہ چینی کرتے ہوئے وہ فرما رہے تھے کہ "اگر ہم
چاہتے ہیں کہ ہماری معاشی حالت بہتر سے بہتر ہو اور ہم دنیا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھیں تو
اس کے لئے ضروری ہے کہ اس موجودہ گندے اور رستے ناسوروں والے نظام کو درہم
برہم کر کے نیا نظام لائیں۔" اتنا کچھ کہنے کے بعد کامریڈ نے ہم سب کی طرف باری باری سے داد طلب
نظریں گھمائیں اور تائید مزید کے منتظر رہے۔ خداداد نے دیکھا کہ اور تو سب خاموش ہیں اب اسے
ہی کچھ بولنا چاہیے اتنے میں کامریڈ بھی اس کی طرف رُخ کر کے بولے۔

"کیوں بھائی تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ہاں سائیں! وہی نظام حیدرآباد دکن والا نا؟ وہ واقعی بیکار اور خراب آدمی ہے
اس کو گدی سے ضرور ہٹا دینا چاہیئے۔"

میرے گریجویٹ دوست نے عوامی چین کے وزیرِ اعظم کو مخاطب کر کے کہا کہ نہ صرف مجھے
خداداد کے اس ایک واقعے کی یاد دلا دی بلکہ اس کی پوری زندگی میرے ذہن کے پردے پہ

اپنے جھلملاتے عکس چھوڑ گئی یہ تو نہیں کہ اس کی زندگی کوئی اتنی پرکشش، رشک آفریں اور ہنگامہ آرائیوں سے پر تھی جو میں بھلائے سے بھی نہ بھول سکوں، اس کی مسکینیت تو اتنی سادہ اور بے سہارا تھی کہ مرنے کے بعد اس کا کوئی نام لیوا بھی نہ رہا سکھر کے لئے تو وہ بالکل گمنام سا تھا تاہم مجھے اس کی ہستی میں ایک عجیب ہستی نظر آتی تھی۔ کہنے کو اس کی زندگی میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جو اسے بزرگ ہستیوں میں شمار کیا جا سکے مگر اس نے اپنی سیرت و کردار کے جو نقوش میرے ذہن پر جاگزیں کئے وہ ایسے ضرور ہیں کہ میں اُسے ایک قابلِ قدر شخصیت کے طور پر یاد کروں۔

سکھر آنے کے بعد تو وہ بالکل خاموش اور گمنام زندگی گذارنے لگا تھا کسی کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کون ہے اور دنیا میں اس کا کوئی عزیز رشتے دار ہے بھی یا نہیں؟ اس نے کسی سے بھی تعلقات بڑھانے کی کوشش نہ کی اس لئے کوئی بھی اس کے زیادہ قریب نہ آ سکا۔ مگر میرا تجسس اسے دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیوں بڑھتا گیا اور بڑی کوششوں کے بعد میں اس کے دبے ہوئے زخموں کو کریدنے میں کامیاب ہو سکا۔

وہ اصل میں جیکب آباد ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد ورثے میں اُسے بیس پچیس ایکڑ زرعی زمین اور کچھ نقدی ملی۔ گاؤں میں اپنے ہی کسی رشتے دار کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد تین سال بڑے خوشگوار گذرے۔ وہ صاحب اولاد بھی ہوا مگر تین سال کے بعد اس کی بیوی نے گاؤں کے ایک نوجوان کو اپنا لیا۔ اسے معلوم ہوا تو اس نے ذات برادری اور گاؤں والوں کو بیچ میں لائے بغیر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور عدت کی مدت گذرنے کے بعد اپنے خرچ پر مطلقہ بیوی کی شادی اس کے آشنا سے کر دی۔ یہی نہیں بلکہ ہر طرف سے بیزار ہو کر اس کے پاس جو کچھ بچی کھچی دولت تھی وہ نئے جوڑے کو دے دی اور زمین اپنے بیٹے کے نام کر دی پھر وہ گاؤں چھوڑ کر سکھر آ گیا اور یہاں محنت مزدوری کرنے لگا۔

پچھلی محرومیوں نے اس کے چال چلن اور رہنے سہنے میں عجیب انقلاب پیدا کر دیا۔ سکھر میں جو وقت اس نے گذارا اس عرصے میں سوائے ہمارے حلقے کے اس کی جان پہچان اور کسی سے نہ تھی۔ صبح سے وہ کام میں لگا رہتا اور شام کو جب فرصت پاتا تو نہا دھو کر ہماری چوپال میں آ بیٹھتا اور پھر وہاں سے ایک کارخانے میں کام کرنے چلا جاتا۔ میں نے اسے کبھی آوارہ گردی کرتے نہیں پایا۔

وہ زیادہ تر چپ چپ رہتا تھا۔ میرے سوالوں میں سے کچھ کے وہ واجبی سے جواب دیتا اور زیادہ تر 'ہوں'، 'ہاں' اور 'ناں' پر ٹال دیتا۔

سیٹھ پریل اُسے چالیس روپیہ مہینہ تنخواہ، سال میں دو ایک جوڑے اور روٹی دیتا تھا۔ میں نے کبھی اُسے اپنے طور پر کوئی کپڑا خریدتے نہیں دیکھا نہ یہ دیکھا یا سنا کہ جو پیسے اسے ملتے ہیں وہ اس نے اپنے کسی شوق پر خرچ کئے ہوں۔ ہم اکثر سوچتے اور آپس میں بات چیت کرتے کہ آخر 'خدن' جو کچھ کماتا ہے وہ کہاں خرچ کرتا ہے؟ اس راز سے پردہ اس وقت ہٹا جب میں ایک مرتبہ سخت بیمار ہو کر مقامی اسپتال کے انڈور وارڈ میں داخل کیا گیا۔ وہاں ایک دن جب وہ مجھے دیکھنے آیا اور کچھ دیر میرے پاس رہ کر واپس چلا گیا تو ایک وارڈ بوائے نے بڑے چاؤ سے میرے قریب آ کر بتایا: " سائیں! یہ تو پاگل درویش ہے پاگل درویش "۔ " وہ کیسے؟" میں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ " سائیں! یہ ہر مہینے اس اسپتال کے غریب اور لاوارث مریضوں میں بہت سے پیسے تقسیم کرتا ہے "۔

کچھ دنوں کے بعد دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ انگریزی حکومت اپنی فوج میں بھرتی کے لئے زبردست پروپیگنڈہ مہم چلانے لگی۔ 'خدن' بھی اخبار کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتا تھا۔ جب سکھر میں بھرتی کرنے والوں کی ٹیم آئی تو اس نے بھی اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کیا اور اس طرح اسے ابتدائی ٹریننگ کے لئے کوئٹہ بھیج دیا گیا لیکن ایک مہینہ مشکل سے ہوا تھا کہ یہ صاحب اپنے ساز و سامان کے ساتھ سکھر واپس آ گئے۔ پوچھا تو بتایا کہ " میڈیکلی ان فٹ کر کے واپس بھیج دیا گیا ہوں اور خاص سبب دراصل یہ تھا کہ ایک شام کو کچھ ساتھیوں نے نشانہ بازی کر کے ایک طوطے کو مار گرایا۔ میں نے دیکھا کہ بیچارہ ابھی اپنی جان سے گیا سو میں نے اُسے اٹھا کر صاف کیا اور بھون کر کھا گیا۔ ساتھیوں نے اس پہ ہنگامہ برپا کر دیا اور انچارج سے رپورٹ کر دی کہ اس نے حرام پرندے کو بھون کر کھایا ہے۔ میں نے بحث کرتے ہوئے کہا کہ اگر طوطا حرام ہے تو خدا نے اسے پیدا ہی کیوں کیا؟ میری اس بات پر بگڑ کر انچارج نے مجھے مینٹل ٹیسٹ کے لئے میڈیکل افسر کے پاس بھیج دیا اور میڈیکل افسر سے جب میں نے یہ کہا کہ اگر سکھ سُور کھائیں تو حرام نہیں میں نے طوطا کھا لیا تو حرام ہو گیا۔ سکھ ڈاکٹر

کو اس بات پر غصّہ آیا اور اُس نے میری رپورٹ خراب کر دی۔"

ڈاکٹر نے ذہنی توازن ٹھیک نہ ہونے کی رپورٹ دی تھی اس لئے بیچارہ خداداد فوج سے نکال دیا گیا۔ کافی عرصے تک بیکار گھومتا رہا آخر میں نے اپنے چچا سے کہہ سُن کر اسے ان کے پاس ملازم رکھوا دیا اور وہ اسے اپنے ساتھ گاؤں لے گئے۔ وہاں قریب قریب چار ہی مہینے رہا ہو گا کہ بوریا بستر سمیٹ کر واپس آ گیا۔ واپسی کا سبب اس نے تو مجھے نہ بتایا لیکن ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد چچا کی زمینوں کا ایک کارندہ میرے پاس آیا تو اس سے ساری بات معلوم ہوئی — اس نے بتایا کہ گاؤں کی مسجد میں ایک ہندو گھس آیا تھا نمازیوں نے اس کی بڑی دُرگت بنائی لیکن خداداد نے اس ہندو کو نہ صرف ان سب کی ضربوں سے بچایا بلکہ پھر کبھی مسجد میں قدم نہ رکھا اور ہر جگہ کہتا پھرا کہ یہ مسجد خدا کا گھر نہیں ملاؤں کا مکان ہے۔ اس پر ملاؤں نے کفر کا فتویٰ دے دیا اور گاؤں کا کوئی مسلمان اس سے بات چیت تک کا روادار نہ رہا مجبوراً اسے پھر شہر کا رُخ کرنا پڑا۔

گاؤں سے واپس آ کر وہ سکھر ہی میں رہا لیکن مجھ سے کئی مہینوں تک نہ ملا اور نہ میں اس سے مل سکا۔ انہیں دنوں مسجد منزل گاہ کے سلسلے میں ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑک اُٹھی۔ شہر میں کافی دنوں تک کرفیو لگا رہا۔ ایک دن کرفیو ہٹائے جانے کے وقفے میں کچھ گھبرایا ہوا سا وہ میرے پاس آیا اور بڑی عجلت میں اپنے آنے کا مقصد بیان کرنے لگا۔ اسے دس روپیہ کی ضرورت تھی سو میں نے اسے دے دیئے۔ کرفیو لگنے میں ابھی دس پانچ منٹ باقی تھے اس لئے میں اُسے روکتا رہا کہ کل صبح کرفیو ہٹنے تک وہ میرے پاس رہے لیکن اس نے میری ایک نہ مانی اور پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

دوسرے دن صبح کو خبر ملی کہ کل شام کو بازار میں کچھ ہندوؤں کو قتل کر دیا گیا اور اس سلسلے میں خداداد کی گرفتاری بھی عمل میں آئی ہے۔ میں بہت پریشان ہوا لیکن اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ مقدمے کی سماعت کے دوران ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا "جس دن شام کو میں تمہارے پاس سے آ رہا تھا تو بازار میں مجھے تین لاشیں نظر آئیں۔ جن میں سے ایک میں کچھ زندگی کے آثار تھے اس وقت ہر طرف بالکل سناٹا تھا میں اس زندہ لاش کی طرف مدد کرنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ ایک فوجی نے تیزی سے میری طرف آ کر مجھے گرفتار کر لیا۔"

اس مقدمے میں خداؔن کو بھی چند دوسرے ملزموں کے ساتھ عمر قید کی سزا دی گئی۔ جیل میں وہ

کیسا رہا اس کے بارے میں مجھے کوئی خاص خبر نہ ہو سکی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے اسے سزا پانے سے پہلے ہی بُھلا دیا تھا حالانکہ اس نے مجھے برابر یاد رکھا اور جیل سے دس روپیہ کا منی آرڈر کر کے وہ رقم بھی واپس کر دی جو اس کے ذمّے تھی۔ اس کے بعد عرصہ دراز تک مجھے اس کی کوئی خیر خبر نہ ملی۔

پاکستان وجود میں آیا تو اس کی خوشی میں بہت سے قیدیوں کو آزادی نصیب ہوئی۔ اس طرح خدّا داد بھی جیل سے رہا ہو گیا اور سیدھا میرے پاس آیا۔ بات چیت کے دوران اس نے بڑی بیقراری سے پوچھا "پریم کہاں ہے؟ مُرلی کدھر ہے؟" اور جب میں نے اس کے ہر سوال کے جواب میں یہی کہا کہ "ہندوستان چلا گیا۔" تو وہ زیادہ دیر میرے پاس نہ بیٹھا اور یہ کہتا ہُوا رخصت ہو گیا کہ "یار! سب ہی چلے گئے تو اب ہم بیٹھ کر کیا کریں۔"

جیل سے نکلنے کے بعد وہ سکھر میں ہی رہا لیکن میرے پاس آنا جانا بالکل ختم کر دیا۔ سارا دن وہ مختلف راستوں پر گھومتا پھرتا رہتا اور رات کو کسی دکان کے آگے نکلے ہوئے تختے یا چبوترے پر سو جاتا۔ ہفتے میں دو تین دن کہیں مزدوری کر لی تو کر لی باقی دنوں کی اسے کوئی فکر نہ ہُوتی۔ جب کبھی اتفاق سے راستے میں مڈبھیڑ ہو جاتی بڑے تپاک سے سلام کر کے ہنستا اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا کہ "یار! سب چلے گئے۔"

خدا داد اب پوچھنے والوں کو اپنا نام خدا داد نہیں بتاتا تھا بلکہ ہاتھ باندھ کر کہتا "بھائی! میں خُدن چریو (پاگل) ہوں۔"

میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہداد پور چلا گیا اور قریب قریب ڈیڑھ سال کے بعد کافی دنوں کے لئے سکھر آیا تو ایک پرانے دوست سے خداداد کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ "خُدن واقعی پاگل ہو گیا تھا اور حکومت کو عجیب احمقانہ خط بھیجتا تھا مثلاً وہ مطالبہ کرتا کہ جب مہاتما گاندھی کے آدمی ہندوستان بھیجے جا رہے ہیں، قائدِ اعظم کے آدمیوں کو پاکستان میں پناہ ملی ہے تو خدا کے بندوں کو خُدا کے ملک میں بھیجا جائے۔"

ان حرکات کی بنا پر ڈاکٹروں کے فیصلے کے مطابق یہ مناسب سمجھا گیا کہ خُدن کے لئے بہترین جگہہ کڈو بند کا پاگل خانہ ہے۔

اتفاق کی بات کہ مجھے اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ حیدر آباد جانا پڑا اور وہاں فرصت کے اوقات میں میں نے سوچا کہ گدو بندر جاکر ذرا خداداد کو بھی دیکھ آؤں۔ متعلقہ عملے سے پوچھتا پچھتا میں اس وارڈ میں پہنچا جہاں خداداد مقیم تھا۔ اس وقت وہ کچھ دوسرے پاگلوں کے ساتھ بڑے موڈ میں باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔

وہ بنا کسی تاخیر کے میرے نزدیک آیا۔ پہلے کچھ دیر خاموشی سے گھورتا رہا پھر یہ کہتا ہوا واپس چلا گیا۔ "تم اچھے ہو سائیں! میں نہ تو خداداد پاکستانی ہوں نہ رام ڈنو ہندوستانی۔ بس خدا آبادی خُدن چریو ہوں۔"

نسیم کھرل

تنویرِ صبح

رات آنچل سمیٹ رہی تھی۔ اخترِ سحری نے مشرقی افق پر طلوع ہو کر اہلِ زمیں کو تاریک رات کے بعد ایک درخشاں صبح کے نمودار ہونے کا پیغام سنایا۔ عائشہ نے کروٹ بدل کر سوئی ہوئی ماں کو دیکھا اور پھر اپنے خیالوں میں کھو گئی" میں نے اس صبح کے انتظار میں بہت دکھ اٹھائے ہیں یہ صبح مجھے گناہوں کی دلدل سے چھٹکارہ دلا دے گی۔ اس ظالم اور بے غیرت ماں سے اور درندہ صفت بے رحم شمسو سے جو ماں کی طرح اس کو سونے کی چڑیا جان کر اس پنجرے میں بند دیکھنا پسند کرتا ہے"

جب بھی عائشہ نے اس گندے ماحول سے نکلنے کی بات کی وہ اپنی خوفناک مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر کہتا" دیکھ لڑکی! بائی نے تجھے لاڈ پیار سے خود سر بنا دیا ہے مگر یاد رکھ یہاں سے بھاگنے کا خیال بھی ......"

عائشہ اس خوفناک درندے کی فطرت سے واقف تھی اس لئے اس کی ٹیڑھی بات پر وہ سر سے پاؤں تک کانپ جاتی۔ اس نے گھبرا کر صحن میں پڑی ہوئی چارپائی کو دیکھا جس پر شمسو سویا کرتا تھا مگر یہ سوچ کر اسے اطمینان ہوا کہ شمسو اس کے بھائی کے ساتھ دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ ماں کے خراٹے خاموشی کا سینہ چاک کر رہے تھے اس نے بڑی حقارت سے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور دکھ سے سوچا۔

"کیا ماں ایسی ہوتی ہے؟ وہ تو اولاد کو پال پوس کر اچھا بناتی ہے۔ زمین پر خدا کا سایہ وہ تو اس سایہ دار درخت کی طرح ہوتی ہے جو گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ سے پناہ دے۔ ماں تو ریگستان کے سینے سے پھوٹنے والے میٹھے چشمے کی طرح ہوتی ہے ـــــ اولاد پر آئی ہوئی مصیبت کے آگے پہاڑ بن جانے والی ہستی ـــ تو پھر یہ کیسی ماں ہے جو بیٹی کو گناہ کی دلدل میں دھکیل کر خود عیش کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے"

اسی سوچ میں اسے اپنی پڑوسن ترنم کی رسمی شادی کا دھیان آ گیا۔ ایک سال ہی کی تو بات تھی۔ پوری برادری جمع تھی۔ آتش بازی اتنی چھوٹی کہ سورج زمین پر اترتا معلوم ہوتا تھا۔ برادری نے روپیہ پانی

کی طرح بہایا زیورات میں لدی پھندی ترنم کو دیکھ کر اُس نے کہا تھا "مبارک ہو باجی! کتنے ارمان ہوتے ہیں اس رات دیکھنے کے۔" کہنے کو تو اُس نے رومانی ناولوں میں پڑھی ہوئی یہ بات کہہ دی مگر جب ترنم نے آنسوؤں کو پیتے ہوئے اسے بتایا کہ "طوائف کی شادی نہیں بلکہ جسم بیچنے کی ابتدائی رسم ادا ہوئی ہے۔ یہ ایک بہلاوا ہے جس سے ناپختہ ذہن آسانی سے گناہ کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہ مذموم رسم قابلِ نفرت ہے۔" تو عائشہ کو ترنم کی باتوں پہ یقین ہی نہیں آیا تھا حالانکہ ترنم نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ وہ ہر رات سولہ سنگھار کرکے دادِ عیش دینے والوں کے دلوں کو بہلاتی اور خالہ خوب روپیہ بٹورتی۔

دفعتاً اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا کیونکہ پلنگ کے چرچرانے کی آواز آئی۔ اس کی ماں نے کروٹ بدلی تھی ــــ عائشہ نے دور افق پر نظریں گاڑ دیں جہاں دن رات گلے مل رہے تھے۔ اس کو صبح صادق کا انتظار تھا جب بازار میں ڈیوٹی دینے والا مرٹا سپاہی چلا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بائی نے اس سپاہی کو خاص رشوت دے کر آنے والے خطرے سے چوکنا کر دیا ہے۔ بائی کے تصور ہی سے اسے گھن آنے لگی "ماں تو وہ مقدس ہستی ہے جس کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔ یہ کیسی بے حس ماں ہے جو پتھر کی بے جان مورتی کی طرح اس کی آہوں اور سسکیوں سے بے نیاز اس پہ ظلم ڈھائے جا رہی تھی۔" اس کے خیالات کا دھارا ایک بار پھر بیتے ہوئے واقعات کی طرف مڑ گیا ــــ وہ گلابی جاڑوں کی خوشگوار شام تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے نرم و لطیف جھونکے اس کے کندن جیسے بدن کو گدگدا رہے تھے اور احساس دلا رہے تھے کہ وہ جوانی کی دہلیز پہ قدم رکھ چکی ہے۔ وہ چھت پہ بیٹھی موسم سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ پڑوس والے کوٹھے سے شاہدہ نے اسے آواز دی اور بازار چلنے کو کہا۔ وہ اپنا پسندیدہ جوڑا نکالنے کے لئے الماری کھولنے لگی۔ مگر اس کے ہاتھ اُٹھے ہی رہ گئے۔ برابر والے کمرے سے شمسو کی آواز آ رہی تھی "دیکھو بائی! آج تیسری اور آخری خواندگی ہوگی اس کے بعد بل منظور ہو کر قانون بن جائے گا جس کی رو سے طوائف کا کاروبار ممنوع ہو گا اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس وقت سے پہلے عائشہ کی رسم ادا کر دو نہیں تو عمر بھر کی محنت برباد ہو جائیگی۔"

بائی کو جیسے شمسو کی باتوں کا یقین ہی نہ آیا "مگر شمسو! یہ کاروبار تو صدیوں سے ہوتا رہا ہے۔ کئی سرپھروں نے اس کو بند کروانے کے نعرے لگائے مگر یہ اُسی طرح چل رہا ہے۔"

"مگر بائی جی! یہ سرپھرا انھیں قومی اسمبلی کا اسپیکر ہے اور مولوی ہے۔ یہ دیکھو اس کی تصویر۔"

تصویر کا نام سن کر عائشہ نے غیر ارادی طور پر دروازے کے پٹ سے سر نکال کر دیکھا۔ شمسو کے ہاتھ میں اخبار تھا جس میں ایک نورانی چہرے والے بزرگ کی تصویر تھی جو اس نے بار ہا اخبار میں دیکھی تھی۔ اس کا دل بول اٹھا۔ "اب یہ گندگی کا کاروبار ضرور بند ہو گا پھر کوئی بائی شمسو جیسے غنڈے کی مدد سے بانو، عائشہ یا ترنم کو جسم بیچنے پر مجبور نہ کر سکے گی۔ کوئی بے غیرت بھائی بہن کی عصمت اس طرح نہ بیچے گا۔" مگر یہ خوش آئند تصور کا محل ریت کے گھروندے کی طرح زمیں بوس ہو گیا۔ بائی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "ابھی وہ اس عمر کو کہاں پہنچی ہے کہ . . . . ." پھر بائی کی بات کاٹتے ہوئے شمسو کی زہریلی آواز اس کے کانوں میں پگھلے ہوتے سیسے کی طرح سرسرانے لگی۔ "تم بھی بڑی بھولی ہو بائی! عائشہ لال پٹ آم نہ سہی ایک لذیز کیری ضرور ہے۔ کیری سے اچار اور چٹخارے والی چٹنی تو بنتی ہے . . . . . تو فکر نہ کر میں نے سیٹھ کریم سے بات کر لی ہے اور . . . . ." وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہ سن سکی اس کا سر چکرانے سا لگا بے سدھ ہو کر وہ پلنگ پر گر پڑی اور اس کے دل کا غبار آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

عائشہ کی رسم پر برادری نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا اس لئے کہ وہ تو بائی کی اکلوتی بیٹی تھی۔ دوسرے یہ کہ حالات جس رخ پر جا رہے تھے کون جانے اس کے بعد ایسی خوشیاں پھر کسی کو نصیب ہوں گی بھی یا نہیں؟

وہ رات اس کے لئے قیامت کی رات تھی جب اس کی عصمت کا جنازہ اٹھنے والا تھا۔ اپنوں ہی کے ہاتھوں وہ گناہوں کی اس بدبودار دلدل میں گاڑی جا رہی تھی۔ اس نے اُس ان دیکھی طاقت کو پکارا کہ اُسے اس دلدل میں گرنے سے بچائے۔ اپنے پیدا کرنے والے سے موت کی دعا مانگی مگر اس کی آہ بے اثر ہو چکی تھی۔ اس نے خودکشی کرنا چاہی لیکن بزدلی نے زندہ رہنے پر اکسایا . . . بس آنسو تھے جو اس دکھ میں اس کا ساتھ دے رہے تھے . . . . . اور جب وہ مکروہ صورت بڈھا سیٹھ کریم اس کے حجلہ عروسی کی طرح سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوا تو نفرت کی ایک شدید لہر اس کو اپنے اندر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھولی ہوئی توند، کوئلے کی طرح سیاہ رنگ چھوٹی چھوٹی مکار آنکھیں اور خضاب لگی داڑھی کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے غلیظ دانت جن سے بدبو کا بھبکا نکل کر اس کی ناک سے ٹکرایا۔ اُسے اُبکائیاں آنے لگیں مگر اس خبیث بوڑھے کے غلیظ جسم میں شیطان حلول کر گیا تھا۔ اس عمر میں بھی

وہ فولادی جسم رکھتا تھا اور اپنی فطرت میں وہ بالکل بھیڑیا تھا بھیڑیا۔ رات بھر اس کے گندے دانت عائشہ کے پھول جیسے گالوں میں چبھتے رہے۔ پھر ہر رات قیامت بن کر اس پہ ٹوٹتی رہی۔ سیٹھ کریم رات بھر اُسے جھنجھوڑتا رہتا اور صبح کو وہ ایک نچی ہوئی لاش کی طرح بے جان پڑی رہتی۔ اس حال میں نہ ماں نے اس کی دلجوئی کی اور نہ بھائی نے صورت دکھائی۔ لے دے کے اس کی سہیلی شاہدہ تھی جو بائی کی ناراضگی کے باوجود اس کے پاس آتی اور آنسوؤں کی روانی میں اضافہ کر جاتی۔ جب کبھی وہ ماں سے کوئی احتجاج کرتی تو جواب میں ممّو کی لاتوں اور گھونسوں سے اس کی تواضع ہوتی۔

ایک مہینے کے بعد جب اس منحوس بڈّھے کا ٹھیکہ ختم ہوا تو وہ خود کو ایک زندہ لاش تصور کرنے لگی۔ اس کے گالوں پہ جگہ جگہ غلیظ دانتوں کے گہرے نشان تھے۔۔۔۔ اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا جیسے اس خبیث بوڑھے کی مکروہ صورت پر تھوک رہی ہو۔ اس کو اپنے ماحول اور دنیا حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی نفرت ہو چکی تھی۔ وہ خود کو دھرتی کا بوجھ تصور کرتی۔ جینے سے بیزار اور موت؟۔۔۔۔ مگر وہ تو مر بھی نہیں سکتی تھی۔

ایک دن شاہدہ نے اسے بتایا کہ حکومت نے فحاشی کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا ہے اور جسموں کا سودا کرنے یا ایسے مذموم پیشے میں معاونت کرنے والوں کو سخت سزا دی جائے گی نیز یہ کہ اگر کسی طوائف کا کفیل، کوئی نائکہ یا کوئی دوسرا شخص ان کو پریشان کرے تو وہ عدالت سے رجوع کر کے حکومت سے تحفظ مانگ سکتی ہیں۔

۔۔۔۔ اور آج اس کی گناہ آلودہ زندگی کی طویل رات ختم ہونے والی تھی۔ ایک نئی سحر مسکرانے والی تھی۔ اس کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ موذن نے اللہ اکبر کی صدا بلند کر کے گنہگاروں کو توبہ کے لئے خدا کے گھر آنے کی دعوت دی وہ ہڑبڑا کر اٹھی اور کپڑوں کے دو جوڑے جو اُس نے رات کو تیار کر کے رکھے تھے ساتھ لئے اور گھر پہ آخری نظر ڈالتی ہوئی زینے سے اترنے لگی۔۔۔۔ تو اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ امید و بیم کی کیفیت میں وہ گلی تک آ گئی اور چھجے کے نیچے رک کر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔ دور تک بازار سنسان پڑا ہوا تھا۔ رات گئے تک دھندا کرنے والی عورتیں بے خبر سوئی ہوئی تھیں صرف آوارہ کتے تھے جو نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ سپاہی شاید بے خبر ہو کر سو گیا تھا۔

وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح چاروں طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ چند قدم آگے چلتے ہوئے وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ لیتی تھی کہ کہیں کوئی اس کا پیچھا نہ کر رہا ہو۔

جب وہ عورتوں کے اس قبرستان سے نکل کر بڑے بازار میں آگئی تو اس کے قدم اعتماد کے ساتھ اُٹھنے لگے۔

جج صاحب نے اس کے حالات سننے کے بعد اسے دارالامان میں بھیجنے کا حکم سنایا تو اس کا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ اب نہ گناہ پر مجبور کرنے والی ماں تھی اور نہ بہن کی کمائی کھانے والا بے غیرت بھائی نہ کوٹھے کی آمدنی پر پلنے والا ظالم شمسو اب وہ ایک عورت تھی جس کو کوئی نہ کوئی گھر بسانے لے جائیگا۔

دارالامان میں ماسی عزت بڑی ہی خدا ترس عورت تھی۔ اسکی حیثیت برگد کے درخت کی چھاؤں جیسی تھی جس کی پناہ میں آکر لاوارث لڑکیاں اپنے دکھ درد بھول جاتی تھیں۔ وہ عائشہ کی دلجوئی میں دن رات لگی رہتی اور یوں عائشہ اس کی ہمدردی و غمگساری سے پرانے زخموں کو کچھ بھرتا ہوا سا پاتی۔

ایک دن ماسی نے اس کو قریب بلایا اور بڑے پیار سے بتایا " دیکھو عائشہ آج تمھیں سیٹھ صاحب کے پاس حاضری دینی ہے۔ وہ اس دارالامان کے سرپرست ہیں۔ بڑے ہی نیک اور خدا ترس مگر تم کوئی بات ایسی نہ کرنا کہ ان کی دل آزاری ہو۔ پھر دیکھنا تم کہ کس طرح تمھارے دن پھر جاتے ہیں"۔

ماسی تو یہ کہہ کر چلی گئی مگر عائشہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ اس کو صرف اتنا یاد رہا کہ سیٹھ صاحب بڑے نیک اور خدا ترس ہیں ان کے سامنے کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے ان کا دل دُکھے۔

وہ دن بھر طرح طرح سے اس نورانی صورت بزرگ کا خاکہ اپنے ذہن میں بناتی رہی اور سوچتی رہی " اگر میں نے اچھا رویہ اختیار کر کے ان کا اعتماد حاصل کر لیا تو وہ مجھے اپنی بیٹی بنا لیں گے اور کسی اسکول میں ملازمت دے دیں گے "۔ ماسی نے اسے بتایا تھا کہ لڑکیوں کے کئی اسکول سیٹھ صاحب کی سرپرستی میں چلتے ہیں۔

رات کا کھانا کھا کر اس نے اپنے کمرے میں ہی نماز ادا کی اور خدا سے اپنی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ماسی آگئی اور اس سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ راستے میں ماسی نے پھر یہ

سمجھایا کہ "اگر تم زمانے کی ٹھوکروں سے بچنا چاہتی ہو تو سیٹھ صاحب کو موم کرنا ہوگا۔"

ماسی کے ساتھ وہ ایک خوبصورت کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی تو اس کا دل کسی انجانے خوف کی وجہ سے دھڑکنے لگا۔۔۔ مگر دوسرے لمحے اسے خیال آیا کہ "وہ بزرگ اور خدا ترس ہے اگر میں نے اس کے دل میں اپنے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا کر لیا تو یہ دھندہ بھی چھوٹ جائے گی۔"

سیٹھ کے کمرے میں جانے سے پہلے ماسی اسے سمجھا بجھا کر چلی گئی اور جب اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ روشنی کی کرن نہیں جگنو کی چمک تھی جو اسے کسی تاریک غار تک لے آئی تھی۔۔۔۔ سامنے ہی سیٹھ کریم بیٹھے ہوئے تھے۔

امر جلیل

خُونی رات

ایک خاموش اور اندھیری رات میں جب سندھ پر شمال کی جانب سے کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے دو نوجوان ایک دوسرے کو قتل کرنے کے ارادے کر کے اپنے اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے۔ نہ وہ پہلے کبھی ملے تھے نہ ایک دوسرے کو پہلے کبھی دیکھا تھا۔ بس دونوں نے ایک دوسرے کا نام سُنا تھا اور سرکشی کے کارناموں سے بھی واقف تھے۔

خون کرنے کا پکا ارادہ کر کے رات کی تاریکی میں وہ دونوں اپنے اپنے دشمن کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ دونوں کو دریائے سندھ کے کنارے بستیوں کے آستاں اور سوکھے سادھ بیلہ کے قریب مقابلہ کرنا تھا۔

جمال اپنی رائفل کندھے پر لٹکائے اور چمکدار خنجر کمر سے باندھے کالی گھوڑی پر سوار ہو کر ٹھیرڑھی سے روانہ ہُوا اس کی روانگی کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ حالانکہ رات کا پہلا پہر بیت چکا تھا پھر بھی گاؤں کے مرد، عورتیں اور بچے اُسے الوداع کہنے کے لئے ٹھیرڑھی کے باہر ڈامر کی سخت اور ہموار سڑک پر جمع ہو گئے تھے۔

جمال جب گاؤں کے باہر کنوئیں کے پاس پہنچا تو ایک ضعیف عورت نے اس کی گھوڑی کی لگام تھام لی۔ گھوڑی ایک لمحہ کے لئے رُکی، ہنہنائی اور بدکنے لگی لیکن جمال کے فولادی بازوؤں نے فوری طور پر اُسے قابو میں کر لیا۔

ضعیف عورت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "خالقو کے باپ نے میرے تین جوان بیٹوں کو قتل کیا تھا تو موئے خالقو کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔"

جمال نے کوئی جواب نہ دیا بس آنکھوں میں خالقو کے لئے نفرت و حقارت اُبھر آئی اور وہ گھوڑی کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔ سب لوگ اندھیرے میں اس کے چہرے پر قہر و غضب اور دشمن سے نفرت کے آثار تلاش کر رہے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے اس کا راستہ روک کر فریاد

کی۔ خالقو کا باپ بھرے گھر سے میری کنوار لے گیا ہے۔"

جمال نے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ کر ہلکے سے دبایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے اندھیرے میں چہروں پر پیدا ہونے والے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پھر وہ شخص بڑبڑانے لگا۔ "میرے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں جمال!" جمال کے منہ پر کالی ململ کی ایک چوڑی پٹی سی بندھی تھی اور اندھیرے میں اس کی آنکھیں تنیر کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے پٹی کھولتے ہوئے دلاسا دیا۔ "اگر زندہ ہوگی تو میں تمہاری کنوار کو ضرور واپس لاؤں گا۔ ..... خالقو کے باپ کی لاش کو میں کنوئیں میں پھینکوں گا۔ اس میں اس بدنصیب عورت کا کیا قصور؟"

"ہم سندھی ہیں جمال!" اس شخص نے بلند آواز میں کہا۔ "ہم بدلہ ضرور لیتے ہیں۔ میری بیوی عصمت دریدہ ہو گئی۔ مجھے خالقو کی لاش چاہیے یا خالقو کی بہن۔"

جمال نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے گھوڑی کو آگے بڑھا دیا۔ چند قدم کے فاصلے پر لوگوں کے ہجوم سے نکل کر ایک قدآور شخص اس کے سامنے آیا اور آگے بڑھ کر کہنے لگا۔ "مجھے پہچانتے ہو جمال؟"

"ہاں۔"

"خالقو کے آدمیوں نے میری فصل کو جلا دیا اور مال لوٹ کر بھاگ گئے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" جمال نے جواب دیا۔ "میں خالقو کی لاش کو اپنی گھوڑی کی پونچھ سے باندھ کر گھسیٹتا ہوا لاؤں گا۔"

اب جمال نے لگامیں کس کر گھوڑی کو سرپٹ دوڑانا شروع کیا اور گرد و غبار کا طوفان اڑاتا ٹھیڑھی کی حدود سے باہر نکل گیا۔ ہجوم سے مختلف آوازیں ابھر ابھر کر اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

"خالقو کی لاش" ـــ "خالقو کا سر لے کر واپس آنا جمال!" ـــ "کاش تیری جوانی قائم رہے جمال! خالقو کو گھوڑی کی ٹاپوں سے کچل کر رکھ دینا۔"

جمال نے ایک ہاتھ سے منہ پر پٹی کو لپیٹا اور گھوڑی کا رخ روہڑی کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑی صبا رفتار ہو کر رات کی خاموشی کا جگر چیرتی آگے بڑھتی رہی۔

رات کے اسی پہر خالقو بندوق کاندھے سے لٹکائے اپنی اچھی اور دودھیا گھوڑی پر سوار ہو کر

رکاب میں پیر جمائے ، گھوڑی کی گردن پر تھپکی دیتے اور ریوالور کی چبھتی ہوئی نالی کو ایک طرف کھسکاتے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کا سر ننگا تھا اور کاندھوں پر اجرک لپٹی ہوئی تھی۔

جب اُس نے چمکارتے ہوئے گھوڑی کو ایڑ لگائی تو وہ آن کی آن میں سانگیوں کی جھگیوں اور کچے گھروں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی گاؤں کے باہر نکل گئی۔

گاؤں کے باہر مٹی کے دڑوں پر گاؤں والے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جس وقت اندھیروں کو چیرتی ہوئی خالقو کی گھوڑی نظر آئی۔ لوگوں کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ قوی ہیکل خالقو نے ان کے قریب آ کر گھوڑی کو روک لیا۔ چند لمحوں کے لئے وہ لوگ آپس میں سرگوشی کرتے رہے پھر سب چپ ہو گئے جیسے خالقو کی آمد نے ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دی ہو یا وقت کے ہاتھوں میں زنجیر پڑ گئی ہو اور وقت حالات کے سامنے سر جھکائے بیٹھا ہو۔ سب کی نگاہیں خالقو پر مرکوز تھیں۔

ہجوم میں سے ایک عورت آدمیوں کی بھیڑ کو ٹھیلتی اور چیرتی پھاڑتی خالقو کے سامنے آئی۔ خالقو نے اس کی جانب دیکھا مگر اندھیرے میں اس کی صورت نظر نہ آئی۔ عورت بڑے غمگین لہجے میں بولی۔ "تین سال ہوئے جمال کے باپ نے میرے شوہر کو قتل کیا تھا۔"

اس کے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکی آواز گلوگیر ہو گئی اور الفاظ اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئے۔ خالقو نے اپنے بازو سیدھے کر کے دایاں ہاتھ اس عورت کے سر پر رکھا اور سسکی بھرتے ہوئے اک آہِ سرد کھینچتی ہوئی بولی۔ "میری شادی کو صرف ایک ہفتہ ہی ہوا تھا۔"

"جمال کا باپ زندہ ہوتا تو میں اسے ٹھکانے لگا کر اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا بہن!" خالقو کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی اسی لہجے میں اس نے بات کو آگے بڑھایا۔ "خیر میں جمال کی لاش کی بوٹیاں سانگیوں کے گاؤں کے کتوں کو کھلاؤں گا۔ ہم اس سے بدلہ ضرور لیں گے۔"

عورت سر پر پڑی ہوئی رلی (سندھی وضع کی چادر) میں منہ چھپاتی ایک طرف کو چلی گئی اور خالقو خاموشی سے آگے بڑھ گیا پھر ایک چھوٹے دڑے کے قریب کسی شخص نے اپنا ہاتھ گھوڑی کی باگوں میں ڈالا۔ گھوڑی چونکی اور بدک کر سرپٹ دوڑنے والی تھی کہ خالقو نے اسے پچکار کر قابو میں رکھا ایک بوڑھا آدمی دڑے سے اتر کر آیا لیکن اس سے کچھ کہا نہ گیا۔ کچھ دیر وہ خاموش رہنے کے بعد خالقو سے رازدارانہ طور پر کوئی بات کہنا چاہتا تھا اس لئے اُس نے خالقو کے شانوں کی طرف ہاتھ بڑھایا

اور خالقو نے اپنا منہ بوڑھے کے منہ سے قریب تر کر لیا۔ بوڑھے نے کانپتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا "میں بے شرم ہوں جواب بھی جی رہا ہوں۔ جمال نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا پھر بھی میں زندہ ہوں۔"

خالقو کے تن بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ "تم نے بھی تو اپنی بیٹی کا خون کیا ہے۔"

"اس کی آبرو لٹ چکی خالقو!" بوڑھے نے افسردہ اور سسکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرے بوڑھے ہاتھوں میں جان ہوتی تو میں جمال کو بھی کتے کی موت مار کر دم لیتا۔"

خالقو اپنے شانے سیدھے کر کے بیٹھ گیا اور پھر بوڑھا بڑبڑایا۔ "مجھے جمال کی لاش لا کر دینا خالقو!" خالقو نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ گیا۔

پچھلے وڑے کے پاس گاؤں کے مرشد سائیں نے خالقو کو روک کر کہا۔ "ارے سن تو سہی اس جمال نے تو مجھ سیّد کو بھی نہ چھوڑا! میری ساری فصل کو جلا کر راکھ کر دیا۔"

"دل چھوٹا نہ کرو سائیں!" خالقو مرشد سائیں کو تسلّی دیتے ہوئے بولا۔ "جب تک اس گاؤں کا ایک بچّہ بھی زندہ ہے تمھاری جھولی خالی نہ رہے گی۔"

"مجھے دولت نہیں جمال کی لاش چاہیے۔"

"فکر نہ کرو سائیں! میں جمال کی لاش تمھارے قدموں میں ڈال دوں گا۔"

"اچھا مجھ سے تعویذ تو لیتے جاؤ فتح پاؤ گے۔"

"ابھی میرے بازوؤں میں جمال کو کچلنے کی طاقت ہے۔"

"کفر بک رہا ہے خالقو! تعویذ لیتا جا۔" بھیڑ میں سے کسی نے آواز لگائی۔

اور جب خالقو تیر کی طرح بھیڑ کے پاس سے گذرا تو اس کے کانوں میں کسی عورت کی آواز آئی۔ "بدزبان خالقو! تعویذ لیتا جا نہیں تو واپس نہ آسکے گا۔"

خالقو نے اپنی گھوڑی کا رخ روہڑی کی طرف موڑ دیا۔ فضا میں پھیلے ہوئے اندھیرے سے کہیں زیادہ دونوں جوانوں کے دلوں میں نفرت و حقارت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جوشِ انتقام میں ان کے بدن کی رگیں لوہے کی طرح سخت ہو گئی تھیں اور آنکھیں ایک دوسرے کی تلاش میں تھیں دونوں اپنے گھوڑوں کی رفتار تیز سے تیز تر کرتے جا رہے تھے اور ان کے پیچھے گرد و غبار کے بادل اڑتے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انسانی نفرتیں حیوانوں کی رگوں میں بھی دوڑ گئی ہیں۔

جمال نے اپنی گھوڑی کو بہرلو کے قریب کچھ دیر سستانے کے لیئے روکا۔ گاؤں کی بیرونی مسجد کے مٹکے سے اس نے ٹین کا ڈبہ لبالب بھرا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ قمیص کی آستین سے اپنا منہ پونچھ کر گھوڑی کے ایالوں پہ ہاتھ پھیرا اور پیٹھ پہ ہاتھ تھپتھپانے لگا۔ گھوڑی ہنہنانے لگی شاید اسے بھی پیاس لگی تھی اس لیئے جمال نے اس کی پیاس بجھانے کا بھی انتظام کیا۔ پھر اس نے رائیفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لی اور اس پہ گرفت مضبوط کر کے نالی پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس وقت ہزاروں خیال اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ خالقو کے جسم کو گولیوں سے چھلنی چھلنی کر دینے کا جذبہ دوسرے تمام خیالوں پہ حاوی ہو گیا۔ اس کی انگلیاں رائیفل کے ٹرگر پہ جم گئیں۔ خالقو کے تصور میں ایک تصویر سی اس کی نگاہوں کے سامنے ابھری جس سے اس کی نگاہِ انتقام جھپٹ سی گئی پھر دفعتاً اس نے رائفل کی نالی کا رخ آسمان کی طرف کیا اور ٹرگر کو دبا دیا۔ ایک گولی بڑی زوردار آواز کے ساتھ رائفل کی نالی سے نکلی اور بادلوں کے آر پار ہو گئی۔ درختوں پہ بسیرا کرنے والے پنچھیوں میں تہلکا مچ گیا۔ گاؤں کے کتے بھونکنے لگے اور جمال تیزی سے اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر ہوا کی طرح بہرلو گاؤں کی حدود سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے گھپ اندھیرے میں کافی دیر تک سہمے ہوئے پرندوں کے پر پھڑپھڑانے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔

جمال اندھیرے کی تہوں کو چیرتا ہوا آگے دندناتا رہا۔ غصے کے عالم میں اس کے دانت جکڑے ہوئے تھے۔ پہاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر جب اس نے چکر کاٹا تو سکھر بیراج کے برقی قمقموں کی تیز روشنی اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی گھوڑی بھی کچھ چونکی، رکی اور پھر کچی ڈگر کو چھوڑ کر پختہ سڑک پر آگئی۔ اس کی ٹاپوں کی آواز سے دیہات کے کتے بھونکنے لگے۔ سنٹرل جیل کی برجیوں اور دروازے پر پہرہ دینے والے اونگھتے سپاہی خبردار ہو گئے۔ جمال نے گھوڑی کو پھر کچے راستے پر ڈال دیا اس طرح کہ بیراج کی روشنیاں اس کا راستہ کھوٹا نہ کر سکیں۔ بیراج اور روہڑی والے بند کے درمیانی حصے میں ایک سپاہی کرسی کی ٹیک سے اپنا سر ٹکائے نیند میں کھویا ہوا تھا اور اس کی بندوق بے پروائی سے سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ بیراج روڈ سے مل کر کچا راستہ ختم ہو گیا۔ جمال نے گھوڑی کی رفتار دھیمی کر دی اور روشنی سے بچتا، سائے میں چھپتا چھپاتا بیراج کی طرف بڑھنے لگا۔

دریائے سندھ کا پانی زور و شور سے بیراج کے دروازوں سے گزر رہا تھا۔ پہلے ہی دروازے کے قریب پہنچ کر جمال نے گھوڑی کی لگامیں کھینچیں اور وہ سرپٹ دوڑتی ہوئی روہڑی کے رخ پہ تیر کی

طرح سپاہی کے قریب سے گزر گئی۔ سپاہی آنکھیں مل کر جماہی لیتے ہوئے چونکا اور رائفل کی طرف ہاتھ بڑھانے لگا لیکن اس سے پہلے ہی جمال نارائیکال کو بھی پیچھے چھوڑتا ہوا گھنے درختوں کے گھپ اندھیروں میں گم ہو گیا۔

دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر حالانکہ سکھر بندر کی بتیاں ٹمٹما رہی تھیں مگر روہڑی کے راستے میں ہیبت ناک اندھیرا تھا۔ بیرلو سے نکلتے وقت بھی جمال نے آسمان پر کالے بادل دیکھے تھے مگر تاریکی ایسی تو نہ تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سوجھے۔ نیم، برگد اور پیپل کے گھنے درختوں کے سائے میں اندھیرا کچھ ایسا ہی تھا اس کے دائیں طرف قائمیوں اور قریشیوں کے باغ تھے جن میں گدرو کھجوریں چتکبرے بادلوں کے پس منظر میں بال بکھیرے ہوئے رقاصاؤں کی طرح جھوم رہی تھیں۔

جمال نے گھوڑی کی رفتار کو دھیما کیا۔ ایسے اندھیرے میں اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہوا۔ اس نے پٹی کو ذرا ڈھیلا کر کے دو چار سانس ذرا لمبے لمبے لئے ایسا کرنے سے اُسے اپنے جکڑے ہوئے سینے میں کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ اب اس کے ذہن میں ایک مرتبہ پھر طرح طرح کے خیالوں کا لامتناہی سلسلہ پھوٹ نکلا۔ گاؤں والوں کے مطالبے اس کے دماغ کے کونوں کھدروں میں ہیجان برپا کرنے لگے پھر اُسے خالقو کا دھیان آیا اور ایک قوی ہیکل جوان اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔

جمال اپنی رائفل کو تھامے سوچنے لگا۔ "خالقو قد آور ہے اس کا سینہ چوڑا چکلا ہے..... مگر میں ایک ہی گولی سے اس کا کام تمام کر سکتا ہوں۔" پھر اس نے اپنے ہی آپ سے سوال کیا۔ "لیکن آخر کیوں؟" اور دوسرے لمحے آپ ہی اپنے آپ کو جواب دیا۔ "ہم سندھی ہیں دشمن سے انتقام لینا ہمارا صدیوں سے شیوہ رہا ہے۔ خالقو کے باپ کی کرتوتوں کی سزا خالقو کو بھگتنی ہو گی۔" دیر تک وہ انہیں خیالوں اور انہیں سوچوں میں ڈوبا رہا۔

جب درختوں کی اوٹ سے لینڈس ڈاؤن برج کی روشنیاں نمودار ہوئیں۔ تب جمال نے اپنی شب رنگ گھوڑی کو ایک برگد کے درخت کی آڑ میں روکا۔ اس کے سامنے تھوڑے سے فاصلے پر سوکھا سادھ بیلا تھا۔ جمال کچھ دیر سانس روکے سوکھے سادھ بیلا کی کوٹھڑیوں کی جانب گھورتا رہا۔ اندھیرے میں اسے کچھ بھی نظر نہ آیا اب وہ انتظار کر رہا تھا کہ بس یہیں خالقو سے اس کا آمنا سامنا ہو گا۔ اس کے کان کسی آواز کے لئے ہر آہٹ پر لگے ہوئے تھے اتنے میں سوکھے

پتوں اور جھاڑیوں کی سرسراہٹ پر اس کے کان کھڑے ہوئے اور وہ رائفل کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے بڑبڑایا۔ "خالقو امردوں کی طرح مقابلہ کر"۔۔۔ اپنی بڑبڑاہٹ کا اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اس کے دل میں یہ شک جاگا کہ جیسے ہر درخت کی آڑ میں خالقو چھپا ہوا ہے۔ اس کے تن بدن میں شعلے سے دہک رہے تھے کہ دوسری مرتبہ پھر سوکھے پتوں والے درختوں کی کھڑکھڑاہٹ اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"شاید تو بزدل ہے خالقو!" وہ چیخا لیکن اب بھی اُسے کوئی جواب نہ ملا اور اس کا شک پختہ ہو گیا کہ دشمن سامنے آکر مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے چھپ چھپ کر دھوکے سے اس پر وار کرے گا۔ بچنے کے لیے سامنے کافی جگہ تھی لیکن پیٹھ خالی تھی۔ ہر لمحہ اُسے اپنی پیٹھ میں خنجر چبھنے کا احساس شدید ہوتا گیا۔ تب اس نے سادھ بیلا کی کوٹھڑیوں کے درمیان چھپ کر بیٹھ جانے کا فیصلہ کیا۔

گھوڑی کا رُخ سادھ بیلا کی طرف کرتے ہوئے اس نے رکابوں میں پیر جمائے زیر لب کچھ کہا اور ہوا ہو گیا۔ پلک جھپکاتے ہی وہ سادھ بیلا کی بیرونی فصیل کے قریب پہنچ گیا۔ اب جو اُس نے گھوڑی کی رفتار کو دھیما کیا تو گھوڑی کی اگلی ٹانگیں کسی شئے سے الجھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ گھوڑی نے ٹھوکر کھائی، جمال کے دونوں پیر رکابوں سے نکل گئے پھر گھوڑی نے ایک قلابازی سی کھائی اور جمال کے قریب ہی لوٹ پوٹ ہو گئی۔ جمال کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ گئی اور اس طرح اچانک گرنے کے سبب اس کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی۔ کچھ دیر وہ اندھیرے میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر بڑے غصے سے خالقو کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر اُسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ تب اس نے اپنی دونوں کہنیوں کو زمین پر ٹکاتے ہوئے خود کو قدرے اٹھانے کی کوشش کی۔ اتنے میں ایک وزنی پیر بوٹ سمیت اس کے سینے پر لگا اور اس کا سینہ پھر زمین سے لگ گیا۔ درد کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر کمر سے بندھے خنجر کو نکالنا چاہا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ خنجر تک پہنچے اس کی کھوپڑی پر بندوق کے کندے کی ضرب پڑی۔ اس کے دونوں بازو تکلیف کے احساس میں زمین سے لپٹ گئے ادھر کمر سے بندھا خنجر بھی نکل کر باہر آ گیا۔

"مجھ سے مذاق کر رہا ہے خالقو!" جمال بڑے غصے میں بڑبڑایا اور جواب میں بندوق کا کندا اس کے منہ پر لگا جس سے خون کا ایک ریلا سا اُبل پڑا جو چہرے سے بہہ بہہ کر شانوں پر گرتا رہا اس کا سارا

منہ خون میں لت پت ہو گیا۔ اس نے پہلو بدل کر خون کو روکنے کی کوشش کی اور قمیص کی آستین سے منہ پونچھتے ہوئے کہا "مجھے آسانی سے نہ مار سکو گے"۔ اب بھی اسے کوئی جواب نہ ملا۔

جمال کروٹ لے کے زمین پر اوندھا لیٹ گیا اور اس پر کچھ غنودگی سی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ اپنی ساری طاقت کو یکجا کر کے ہاتھوں کے سہارے خود کو سیدھا کرنے لگا عین اسی وقت اسے ایک زوردار لات لگی اور وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔ اس کی ٹانگیں سمٹ کر بالکل چھاتی سے مل گئیں۔ آنکھوں میں شرارے ناچنے لگے اور دم سینے میں اٹکنے لگا۔ بدن تو پہلے ہی چور چور تھا اب دماغ بھی چکر کھانے لگا۔

درد و کرب کی اس شدت میں بس اسے اتنا ہی کچھ محسوس ہو سکا کہ اس کے دونوں ہاتھ رسّی سے جکڑے ہوئے ہیں اور اسے کوئی اٹھا کر ایک کوٹھڑی کے اندر ڈال گیا ہے۔ کوٹھڑی کا دروازہ بغیر کواڑوں کے تھا اور اس کو بند کرنے کے لئے کوئی پرانا تخت استعمال کیا گیا تھا۔ تخت کو ایک طرف کھسکا کر اُسے کوٹھڑی کے اندر دھکیل دیا گیا تھا۔ دروازے سے اندر گرتے ہوئے وہ ایک انسانی جسم سے چھوتا ہوا سیدھا دیوار سے جا کر لگا۔ ایک ہلکی سی کراہ اندھیرے میں ابھری اور خاموش ہو گئی۔ دیوار سے ٹیک لگا کر جمال نے کوٹھڑی کی چھت کی طرف دیکھا۔ مگر وہاں چھت تو نہ تھی البتہ کالے کالے بادل پہاڑوں کی طرح آسمان سے چمٹے ہوئے تھے۔ بادلوں سے نگاہ ہٹاتے ہوئے اس نے کوٹھڑی کے اندر کا جائزہ لینا چاہا لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ تب اسے خیال آیا کہ کوئی شخص اس کوٹھڑی کے بیچوں بیچ سویا ہوا ہے اسی کے جسم سے چھوتا ہوا وہ دیوار سے جا لگا تھا اس نے آہستہ سے پوچھا "کون ہو؟"

"تم کون ہو؟" اجنبی نے جواب دینے کی بجائے خود ہی سوال کر دیا۔

"میں راہگیر ہوں"

"میں مسافر ہوں"

پھر دونوں چپ ہو گئے اور کوئی بات نہ کی۔ دفعتاً اندھیرے میں جمال نے اس شخص کو فرش سے اٹھتے ہوئے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے محسوس کیا۔

جمال کی رگ رگ میں خالقو کے لئے نفرت دوڑ رہی تھی اور حقارت کی شدت سے اس کی نس نس

میں آگ سی بھری تھی۔ اس نے سوچا۔" خالقو کو وار کرنے کا موقعہ نہ دینا چاہیے تھا کیوں نہ میں وہیں درخت کی اوٹ میں چھپا رہتا مجھے یہ خبر نہ تھی کہ خالقو ایسی مکاری سے مجھے دھوکا دے گا۔"

" وہ خیالوں ہی خیالوں میں خالقو کی بوٹیاں چبانے کے لئے دانت پیس کر رہ گیا۔

" وہ کون ہے؟" اجنبی کی آواز پر جمال کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

" کون؟"

" جس نے ہم دونوں پر یہ ظلم کیا ہے۔"

" خدا جانے کون ہے؟"

" کیا تم اسے نہیں پہچانتے؟"

" نہ" جمال نے کچھ سوچ کر بات کو بڑھایا۔" سوکھے سادھ بیلے میں ڈاکے پڑتے رہتے ہیں ہوگا کوئی ڈاکو"۔ اب جمال اجنبی کی آواز سے اندازہ لگا کر اس کے قریب کھسک کر بیٹھ گیا۔ اس کی ہڈی ہڈی درد سے چور چور تھی قمیص کی آستین سے ایک مرتبہ پھر اس نے ہونٹوں سے رستے ہوئے خون کو پونچھا۔ پھر بیٹھے بیٹھے وہ اپنے زخموں کو بھول کر اجنبی کی حالت پر غور کرنے لگا۔" شیروں کی لڑائی میں یہ بیچارا مفت میں مارا گیا۔"

اسے اجنبی پر رحم آیا اور اس حالت کو خالقو کی ذلالت پر محمول کرنے لگا۔

" تم آدھی رات کو کہاں جا رہے تھے؟" اجنبی نے اس سے پوچھا۔

جمال کے سینے میں دل گیند کی طرح اچھلنے لگا۔ وہ اس سوال کے لئے بالکل تیار نہ تھا لیکن بات بنانے کے لئے جواب دیا۔" بیدل سائیں کی درگاہ پر حاضری دینے اور سلام کرنے نکلا تھا۔"

" اس وقت۔"

" کیوں کیا حاضری اور سلام کے لئے بھی کوئی وقت مقرر ہے کیا؟"

اجنبی کوئی جواب نہ دے سکا تب جمال نے اس سے سوال کیا" اور تم اس آدھی رات کو کدھر کے لئے نکلے تھے؟"

" میں سکھر جا رہا تھا۔"

کچھ دیر کوٹھڑی میں سکوت طاری رہا اور نجانے کیوں جمال کے دل میں ایک شک سا جاگا اور

پھر سو گیا۔

"نڈھال ہو گئے ہو؟" اجنبی کی آواز پر اس نے کان کھڑے کئے۔

"کیا کہا؟"

"کیا زیادہ زخمی ہو؟"

"نہیں تو۔"

"تمہاری آواز سے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"ہونٹوں سے خون رِسنا بند نہیں ہو رہا ہے۔" جمال نے آہستہ سے جواب دیا۔

"دیکھوں۔" اجنبی جمال کی طرف سرکا۔ تب جمال نے قدرے زور دے کر کہا۔" اندھیرے میں کیا دیکھ سکو گے؟ ۔۔۔ کمر میں درد کی سخت چبھن محسوس کر رہا ہوں۔ دیکھنا کہیں پسلی تو نہیں ٹوٹ گئی۔"

"میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔" اجنبی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔" میرے ہاتھ کھولو تو دیکھوں۔"

"میرے ہاتھ بھی بندھے ہوئے ہیں۔ کیسے کھولوں؟"

"دانتوں سے۔"

"میرے دونوں ہونٹ لہولہان ہیں۔"

"اچھا ہاتھ بڑھاؤ تو پہلے میں تمہارے بازوؤں سے رسّی کھولوں۔"

جمال نے اپنے دونوں ہاتھ اجنبی کی رانوں پہ رکھے۔ اجنبی نے تھوڑی سی کوشش سے اپنے دانتوں کی مدد لے کر رسی کھول دی۔

جمال کو رستگاری مل گئی۔ اندھیرے میں اپنے محسن کی طرف دیکھنا چاہا مگر دیکھ نہ سکا۔ آزادی کے احساس میں اس کے احسان کا خیال ایسا گھل مِل گیا کہ کچھ دیر وہ اسی خیال میں کھویا رہا۔ بازو کیا کھلے کہ جیسے مرجھائی ہوئی رُوح میں تازگی لوٹ آئی۔ اب وہ زخموں کی ٹیس بھول گیا۔ اس کا دل پھڑکنے لگا کہ فوراً تختہ کو ہٹا کر باہر نکلے اور خالقو کے بھیجے کا کچومر بنا دے۔ اُس کے پیٹ میں ایسی ٹھوکریں لگائے کہ آنتیں باہر آجائیں۔

"میرے ہاتھوں کی رسی نہ کھولو گے؟" اجنبی نے اس کے خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا۔

" ہاں ہاں کیوں نہیں ؟" جمال نے اپنی کوتاہی محسوس کی اور جھٹ پٹ اس کے تمام بندھن کھول دیئے ۔

اجنبی نے اپنے بازوؤں کو ہوا میں لہرایا اور اِدھر اُدھر گھما کر دیکھا ۔

جمال نے رسیوں کو کھولتے وقت ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس کا ساتھی غیر معمولی طاقت کا مالک ہے اس سے رہا نہ گیا ۔" تمہیں آسانی سے تو قابو میں نہ کیا گیا ہوگا ؟"

اجنبی نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا پھر کچھ سوچ کر بولا ۔" میں اس شخص کو قتل کر دوں گا ۔"

جمال کا دل خوشی سے اچھلنے لگا ۔ اجنبی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے اس نے بھی اپنا عزم ظاہر کیا ۔" میں بھی اس کو قتل کر کے لاش کو اپنی گھوڑی کی ٹاپوں تلے روند دوں گا ۔"

دونوں نے ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن دیکھ نہ سکے اس لئے ایک دوسرے کے وجود کو ہاتھ سے چھو کر محسوس کرنے لگے ۔ ان کے ہاتھ آپس میں جکڑ گئے ۔ جذبے اور خیال کی یکسانیت اور ہم آہنگی نے دونوں کو بیحد قریب کر دیا ۔

جمال نے اجنبی سے پوچھا ۔" تمہارا نام کیا ہے ؟"

اجنبی پہلے تو کچھ ہٹپٹایا پھر قدرے رُک کر جواب دیا ۔" میں عالمو کھوسو ہوں اور تم ؟"

" میں کمال جکھرانی ہوں ۔" جمال نے فوراً پلٹ کر جواب دیا ۔

" تمہاری کوکھ کا اب کیا حال ہے ؟"

" درد ہے ۔"

" دیکھوں ۔" اجنبی نے جمال کی کمر کے قریب کوکھ پہ ہاتھ رکھا اور ہلکا سا زور دے کر کہا ۔" کوئی خاص بات نہیں ۔"

" پر درد تو بہت ہو رہا ہے ۔"

اجنبی نے اپنی اجرک کو جمال کی کوکھ اور کمر پہ لپیٹتے ہوئے ہمدردی ظاہر کی ۔" ظالم ! تمہیں تو اتنا نہ مارنا ۔"

" میں آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں دوست !"

اجنبی کو جمال کی یہ ادا پسند آئی ۔ اس کی کوکھ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا ۔" کتنے بچے ہیں تمہارے ؟"

"ابھی شادی شدہ نہیں ہوں۔"

"شادی شدہ نہیں ہو؟ آخر کیوں؟"

"جس سے شادی کرنا چاہتا تھا وہی نہ رہی تو پھر کس سے کرتا؟" جمال کا لہجہ غمناک ہو گیا۔

"ایسا کیوں ہوا۔"

جمال کا گلا سوکھ سا گیا اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور چپ رہا۔ جو کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ نہ سکا۔ "بتاؤ تو سہی آخر کیا ہوا؟" اجنبی نے پھر پوچھا۔

"جس سے شادی ہونی تھی اسے مار کر کنویں میں پھینک دیا۔"

"اُف!" اجنبی کے منہ سے ہلکی سی آواز نکلی۔ "آخر کیوں؟"

"وہ مجھ پر جان نچھاور کرتی تھی۔" جمال کی آواز میں عجیب سا کرب ابھرا۔ اسی درد بھرے لہجے میں وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا اور اجنبی نے اس کی بات پکڑ لی۔ "پھر تو براہِ راست اس کے والدین سے رشتے کی بات کرنی تھی۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو دوست!" جمال نے کچھ اکتاہٹ کے لہجے میں ٹوکا۔ "دونوں خاندانوں میں صدیوں سے دشمنی چلی آ رہی ہے ہم ایک دوسرے سے انتقام لیتے رہے ہیں۔"

"انتقام؟"

"ہاں ہاں انتقام۔"

"چند لمحوں کے لئے دونوں دیوار سے اپنے سر ٹیکائے اور آنکھیں موندے کچھ سوچتے رہے جیسے کسی مشکل مسئلے کا حل تلاش کر رہے ہوں۔ ماحول کی خاموشی کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سامان سے بھرے ہوئے ٹرکوں کی آمد و رفت کچھ توڑتی رہی یا رک رک کر کچھ سوکھے پتے اور خس و خاشاک ہوا میں منتشر ہو کر تھوڑی تھوڑی آہٹ پیدا کرتے رہے۔

اجنبی نے آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل بکھر رہے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کمر سے بندھے ہوئے ریوالور کو ٹٹول کر اپنی گرفت میں لیا پھر اس پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے جمال کی طرف بڑھایا تاریکی میں ریوالور کی نالی جمال کے سینے سے جا لگی۔ اس فوراً ہی ریوالور کی نالی کو اپنی مٹھی میں بھینچتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"ریوالور۔"

"یہ تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں پر اسے تم لائے کہاں سے؟"

"میرے پاس ہی تھا۔" اجنبی نے جواب دیا۔ "جس دشمن نے مجھ کو دھوکا دیا ہے اس کے سینے میں اس کی آدھی درجن گولیاں پار کروں گا۔"

جمال کے تن بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ریوالور کی نال پر اس نے اپنی مٹھی کو اور مضبوط کیا۔ ذہن میں شک و شبہ کی کرنیں اتنی تیز ہو گئیں کہ آنکھوں میں چکا چوند سی ہونے لگی۔ وہ اپنی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ اجنبی نے سکوت کو توڑا۔ "تم میری پیٹھ پر پیر رکھ کر دیوار کو دو اور بھاگ جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میرے پاس ریوالور ہے۔ میں جب تک اپنے دشمن کو ٹھکانے نہیں لگا دوں گا یہاں سے نہ جاؤں گا۔"

جمال نے آہستہ سے کہا۔ "مگر وہ دھوکے باز ہے۔"

"پروا نہیں۔ بس تم دیوار پھاند کر بھاگ جاؤ۔"

"میں ایسا نہیں کروں گا۔ تمھیں موت کے منہ میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں یہ بزدلی ہو گی۔"

"تو پھر؟"

"صبح ہوتے ہی ہم دونوں مل کر اسے قتل کریں گے۔"

"ہاں وہ ہم دونوں کا دشمن ہے ___ تم ریوالور سنبھالو ممکن ہے میری آنکھ لگ جائے۔"

جمال نے اجنبی سے ریوالور لے کر اپنے ہاتھ میں تھاما۔ پھر دونوں پیر پسار کر دیوار کی ٹیک لگائے بیٹھے رہے اسی طرح بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی۔ پنکھیرو اپنے آشیانوں سے نکل کر ہواؤں پر پھڑپھڑانے لگے۔ اور جب سورج کی کرنیں کھجوروں کے درختوں پر پڑنے لگیں تو جمال نے اجنبی کے شانوں کو ہلا کر خبردار کیا۔

"سویرا ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اندر آ کر ہم دونوں کو مار ڈالے کیوں نہ ہم ہی باہر نکل کر اسے قتل کر دیں۔" دونوں اٹھ بیٹھے۔ روشنی میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ کر ان کے چہروں پر مسکراہٹ ابھر آئی پھر وہ کچھ دیر بڑی معصومیت سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"تاریکی نے ہمیں اندھا کر دیا تھا۔" جمال نے سلسلہ گفتگو چھیڑا۔ اجنبی بھی کچھ کہنا چاہتا تھا کہ باہر سوکھے پتوں میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ دونوں ایک مرتبہ پھر دیوار سے لگ کر سانس روکے بیٹھے رہے جب کافی دیر تک کوٹھڑی کے دروازے سے تخت ہٹنے کی آواز نہ آئی تو دونوں آہستہ آہستہ سرک تخت کے پاس آ بیٹھے۔

اجنبی بولا۔"میں تخت کو ہٹاؤں گا۔ تم دشمن پر گولیوں کی بوچھاڑ کرتے سیدھے جاکر دریائے سندھ میں چھلانگ لگا دینا۔"

"اور تم ؟"

"میں باغوں سے نکل کر شاہ مقصود کی پہاڑی پر ہوتا ہوا آگے بھاگ جاؤں گا۔"

"اور پھر ؟" جمال کے اس سوال پر اجنبی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔" زندگی رہی تو کہیں نہ کہیں ضرور ملیں گے۔"

اب جمال تخت کی طرف منہ کئے ریوالور تان کر بیٹھ گیا۔ اجنبی نے تخت سرکانے کے لئے ہاتھ بڑھائے اور منہ کو جمال کی طرف پھیرا۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے گلے ملنے کی تمنا جاگ اٹھی۔

اجنبی نے تخت کو دھکیلا۔ باغوں میں ابھی صبح کی پہلی کرنیں نمودار ہوئی تھیں۔ ایک دیو جیسا سایہ کوٹھڑی کے باہر سوکھے پتوں پر پڑا ہوا نظر آیا جسے دیکھ کر جمال بولا۔" انسان ہے یا آفت ؟"

"ہم دونوں آفت سے بڑھ کر ہیں۔" اجنبی نے ہیکڑی جتائی۔

دونوں کی نگاہیں سایہ پر مرکوز تھیں تب جمال نے آہستہ سے کہا۔"یہ یقیناً خالقو ہے۔"

"تم خالقو کو کیا جانو ؟" اجنبی نے جمال کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس علاقے میں خالقو سے زیادہ اچھا جوان اور کوئی نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں یہ سایہ خالقو کا نہیں ہے —— یہ تو جمال ہے۔"

"یہ جمال کا سایہ نہیں ہے۔"

"کیسے کہتے ہو ؟"

جمال نے اجنبی کی طرف دیکھا اور تخت کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا اب ریوالور کا رُخ اجنبی کی طرف

تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر دفعتاً جمال نے کہا "میں جمال ہوں۔"

اجنبی بڑی حیرت اور اچنبھے سے اسے گھورنے لگا پھر اچھل کر اس نے تخت کو زوردار لات مار کر ایک طرف کو گرا دیا اور پلک جھپکتے ہی اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا لیکن کوئی شخص نظر نہ آیا۔ اب جمال بھی اس کے ساتھ بڑھ کر تخت پر بیٹھ گیا اور دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ کوٹھڑی کے دروازے کے پاس برگد کا بڑا درخت کھڑا تھا اور اس کا سایہ کوٹھڑی کے دروازے کے سامنے سوکھے پتوں پر پڑ رہا تھا۔

اب جمال نے ریوالور کو ہاتھ میں نچاتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے بزدل خالقو بھاگ گیا ہو؟"

"نہیں۔" اجنبی نے جمال کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "میں ہوں خالقو۔"

جمال کی سٹی گم ہو گئی۔ انگلیاں ریوالور پر جم سی گئیں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ خالقو کو سر سے پیر تک دیکھ کر اس کی نگاہیں ریوالور پر مرکوز ہو گئیں۔ پھر اس نے ریوالور میں نظریں گڑاتے ہوئے اچٹتی نظر سے خالقو کو تاکا اور من ہی من میں فیصلے کرتا اور توڑتا رہا۔

خالقو دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً جمال نے تیور بدل کر پوری قوت سے ریوالور دریائے سندھ کی طرف اچھال دیا۔

ریوالور بیل کے پتوں سے الجھتا کچھ املتاس گراتا سندھ کی آغوش میں ڈوب گیا۔

خالقو اور جمال نے سوکھے سادھ بیلا کی بیرونی دیوار کی طرف دیکھا جہاں نہ ان کی کھوڑیاں تھیں اور نہ ہی رائفلیں۔

زیڈ۔ اے۔ شیخ

آنسو — اور — تبسّم

"مجھے زندگی چاہیے وہ زندگی جس میں ذرا بھی تلخی نہ ہو۔ مجھے اپنی زندگی کا وہ حصّہ چاہیے جو برباد ہو چکا ہے جس کی حقیقت کی تلخی نے مجھے اس قدر بے چین کر رکھا ہے کہ موجودہ زندگی سے اُکتا چکی ہوں۔"

اس نے اپنی پُرسوز آنکھوں سے آصف کو دیکھا جس کی صورت اسے کچھ دھندلی دھندلی سی نظر آئی شازیہ نے بے اختیار ہو کر اپنے دونوں ہاتھ آصف کے آگے پھیلا دیئے۔ وہ خاموش تھا اور بُت بنا بیٹھا رہا۔ شازیہ بدستور بڑبڑاتی رہی "زندگی کی حقیقت اتنی تلخ کیوں ہوتی ہے؟ اگر اتنی ہی تلخ ہے تو پھر یہ زندگی کیوں......؟"

دونوں زندگی کی ان راہوں پر ملے تھے جہاں اُن کی زندگی خوشگوار بن سکتی تھی مگر چند قدموں کے بعد یہ راہ، یہ حقیقت اتنی تلخ ہو گئی جو دونوں سکون کی تلاش میں بھٹکنے لگے اور شازیہ اس صورتِ حال سے کبھی حیران تھی کبھی پریشان۔

آج اس نے سوچا تھا کہ آصف سے یہ فیصلہ کر کے ہی رہے گی کہ آخر اس کا قصور کیا ہے؟ کیا زندگی کی تمنا کوئی قصور یا کوئی جرم ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر زندگی کیوں؟ لیکن جب آصف نے اسے دنیا کا فیصلہ سنایا تو اسے اپنے دل کے تار ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس سے دنیا نے ایک بار پھر وہ بہاریں چھین لیں جنھیں سمیٹنے کے لئے اس کی زندگی کا کتنا حصّہ بیت چکا تھا۔ اب اسکی آنکھوں میں لہو کے آنسو تھے اور لبوں پر مسکراہٹ وہ مسکراہٹ جس میں نہ روحِ شگفتگی تھی نہ بہارِ آرزو اور نہ زندگی کی تمنا بلکہ اس مسکراہٹ میں ایک عجیب سی تلخی نمایاں تھی۔

بظاہر اس کی زندگی خوشگوار اور پُرسکون سی لگتی تھی مگر جب وہ اپنی روح کی ویرانی پر غور کرتی تو خود حیران ہو جاتی — اس نے جب ہوش سنبھالا تو گھر کے ایک گوشے میں بیمار باپ کو دیکھا اور اُس ماں کو بھی جسے کبھی کبھی دل کے شدید دورے پڑتے تھے۔ دو بڑے بھائی اپنی شادیوں کے بعد گھر چھوڑ کر خدا جانے کہاں چلے گئے تھے۔ بس ایک بڑا بھائی اور چھوٹی بہن اس کے ساتھ تھے۔ اس کی یہ چھوٹی سی

دنیا کتنی عجیب تھی۔ گھر میں ہر وقت ایک گہری خاموشی چھائی رہتی اور یہ خاموشی اس وقت ٹوٹتی جب ماں کو دل کا دورہ پڑتا اور گھر کے ان تین افراد میں افراتفری پھیل جاتی۔ یہ حالت کچھ دیر تک زندگی کی ہلچل برقرار رکھتی اور اس کے بعد پھر وہی خاموشی طاری ہو جاتی۔ اور اب اس خاموشی سے اُسے وحشت ہونے لگی تھی ۔۔ اُس نے اِس خاموشی سے فرار حاصل کرنے کے لئے کچھ سہیلیوں کا سہارا لیا تاکہ اُن سے مل جل کر کچھ دیر کو اس وحشت خیز ماحول سے چھٹکارا مل سکے آہستہ آہستہ اس نے ویران کھنڈر جیسی روح میں کچھ زندگی محسوس کی۔ جب وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ہوتی اور ان کے لبوں پر قہقہے گونجتے تو اسے محسوس ہوتا جیسے پوری کائنات پر بہار ہو گئی ہے لیکن یہ بہار یہ نغمے صرف چند لمحوں کے مہمان ہوتے حالانکہ شازیہ چاہتی تھی کہ اس کے گھر کا گوشہ گوشہ ایسے قہقہوں سے گونج اُٹھے جن کی بازگشت پوری کائنات پر محیط ہو جائے۔ گھر کے ہر فرد کے چہرے پر بہار ہی بہار ہو مگر جو کچھ وہ چاہتی تھی صرف سوچنے سے نہ مل سکتا تھا۔

باپ کی اچانک موت نے اس کے لبوں سے رہی سہی بہار بھی چھین لی۔ وقت بھی کتنا ظالم ہے ؟ وہ بدحواس ہو گئی جیسے اس کے ذہن نے سوچنا چھوڑ دیا ہو۔ اپنی بدقسمتی کا غم اسے رہ رہ کر کچوکے دیتا رہا۔" کیا اس گھر میں کبھی بھی خوشی کی بہار نہ آئے گی ؟ کیا اسی طرح ہر ایک کے چہرے پر خزاں کی مردنی چھائے رہے گی ؟ نہیں ایسا نہ ہو گا۔" اس کے ذہن نے نئے انداز سے سوچنا شروع کیا۔" میں وقت اور حالات سے مقابلہ کروں گی چاہے کچھ بھی ہو۔"

شازیہ نے بڑی وارفتگی سے اپنے آپ کو پیاری ماں کی آغوش میں سمیٹتے ہوئے التجا کی۔" اماں! میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں ؟"

" اس لئے کہ اب یہ ویرانی، وحشت، خاموشی اور خوف میری برداشت سے باہر ہے۔ میں زندگی کا ایک نیا رُخ دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ رُخ جس میں خوشی کی لہر ہو۔ بہار کی جھلک ہو اور جس میں خزاں کا کوئی نشان بھی نہ ہو۔" وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

" یہ رُخ تمھاری نوکری سے نہیں بلکہ شادی سے ممکن ہے۔ میں تمھاری شادی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔

" نہیں اماں! میری شادی سے اس گھر پر اور زیادہ ویرانی چھا جائے گی اور بہار ادھر بھول کر

بھی نہ آئے گی۔جب تک آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہے میں شادی نہیں کروں گی۔ وہ بہار جس سے یہ گھر محروم ہو چکا ہے میں اس بہار کو واپس لاؤں گی۔ آپ نے تو ہر دکھ درد اور کتنے ہی رنج و الم جھیلے مگر کسی عالم میں بھی ہمیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ آج جب ہمیں آپ کی شفقتوں اور محبتوں نے پال پوس کر توانا بنا دیا تو میں کس دل سے آپ کو اور زیادہ دکھوں اور غموں میں ڈھکیل کر چلی جاؤں۔ کیا ہمارا یہی فرض ہے؟"

ماں خاموشی سے اُسے تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے اپنی دونوں بانہیں بیٹی کے آگے پھیلا دیں۔ شانزیہ اپنی ماں کی کمزور بانہوں میں ایک ٹوٹے تار کی طرح گر گئی اور ماں نے اسے اپنے سینے سے کچھ اس طرح لگا لیا جیسے اس میں اب بھی اتنی طاقت موجود ہے کہ ان کے دکھ درد کو سمیٹ سکتی ہے۔

آج جب شانزیہ نے گھر میں قدم رکھا تو اس کی ماں نے بڑی اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جس طرح بیٹوں نے نوکری کرنے کے بعد اس سے منہ موڑ لیا تھا شانزیہ بھی ملازمت کے بعد پہلے سے مختلف ہو جائے مگر بیٹی کی ضد کے آگے وہ بے بس ہو گئی۔

شانزیہ نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بڑے پیار سے کہا "اماں! خوش ہو جاؤ کہ کل میں تمہارے چہرے پر یہ اداسی نہیں دیکھنا چاہتی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں خوش نہ رہوں؟"

"نہیں بیٹی! ایسا نہیں ہے میں نے تو کچھ اور سوچا تھا۔"

"اماں! آپ آئندہ ایسا نہ کہیں تمہیں تو سچ کہتی ہوں ......" وہ ماں سے الگ ہو گئی۔

"نہیں بیٹی! مجھے تو تیری خوشی دنیا سے زیادہ عزیز ہے جس میں تو خوش ہو وہی میری خوشی بھی ہے۔"

اس نے فرطِ محبت میں شانزیہ کو اس طرح گلے لگا لیا جیسے وہ اسے اپنی آغوش میں چھپا لے گی۔

وقت بڑی تیزی سے گزرتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے شانزیہ کی زندگی کو ایسے موڑ پہ لے آیا جہاں اسے نئے دکھوں اور نئی دشواریوں سے سابقہ پڑا۔ اس مقام پہ جہاں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم آگے بڑھنے لگے۔ جہاں اُسے محسوس ہوا کہ اس اداس مضطرب سرمئی شام میں کوئی صدیوں سے

اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے بڑھ کر انتظار کرنے والے کی بے خواب اور نیند سے اچاٹ رہنے والی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا بے چین ہو کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکی کیونکہ اُسے ان آنکھوں میں اپنا ہی عکس نظر آیا۔ اُس نے کسی کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنا تو بے اختیار اس کی آغوش میں سما گئی۔ اُن آنکھوں میں اس کے لئے پیار اور بے پناہ چاہت کی لہریں تھیں دل اس کے لئے جانے کب سے دھڑک رہا تھا۔ ہاں وہ آصف تھا جو اُسے زندگی کے ایسے موڑ اور ایسی راہ پر ملا تھا اور کچھ اس انداز سے ملا تھا کہ وہ آصف کی ہو گئی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ آصف سے اُسے ایسا پیار اور اتنی محبت ہو جائے گی کہ اس کے بغیر زندگی میں کوئی کشش باقی نہ رہے گی۔

وہ کس قدر خوش تھی یہ تو اس کا دل ہی جانتا ہو گا۔ ہاں اسے اپنی ماں سے بھی بے پناہ محبت تھی اور اُسے خوش رکھنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے؟ اپنی بہن سے بھی اُسے بے حد پیار تھا جس کے مستقبل کی فکر بہر حال رہی تھی رہا بھائی تو اس کے لئے اس کی چاہت کی سوچ کچھ مختلف تھی کتنی زندگیوں کی خوشگوار توقعات اس نے اپنے بھائی سے وابستہ کر رکھی تھیں؟ مگر یہ کیسی محبت تھی جس میں زندگی کی ہر تمنا، ہر خواہش اور ہر حسرت نے ایک نیا جنم لیا تھا؟

اُسے کچھ یاد نہ تھا کہ آصف اس کی زندگی میں کیسے داخل ہوا البتہ وہ عالم بے اختیاری اور جذبہ سرشاری میں ان راہوں پر تیزی سے گامزن ضرور تھی جہاں آصف اس کے لئے اپنی آغوش وا کئے ہوئے تھا جب کبھی وہ اُداس ہو جاتی تو آصف بڑے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر التجا کرتا۔

" خدارا شازی! تم اتنی اداس نہ رہا کرو۔ تمہاری اداسی سے میں کانپ کانپ اٹھتا ہوں۔ تمہارے چہرے پر خزاں کا سایہ دیکھ کر بیقرار ہو جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تم ہنسو اور اس طرح ہنسو کہ اس ہنسی میں میری مسکراہٹیں بھی سمیٹ لو"

وہ بے چین ہو کر آصف کے چہرے کو غور سے دیکھتی اور اس کے نکھرے پر مسکراہٹیں بکھرنے لگتیں وہ مسکراہٹیں جو اس کے ہر دکھ درد اور ساری پریشانیوں کو فراموش کر دیتیں۔

" شازی! تمھیں خبر ہے کہ زندگی نہ ملی تو پھر . . . . . "

" تو پھر میں زندہ ہی نہ رہ سکوں گی " وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

" اچھا بتاؤ میں زندہ کیسے رہ سکتا ہوں؟"

"کیوں؟"

" سچ شازیہ! میں تو مر جاؤں گا۔کوئی بھی اپنی زندگی کے بغیر کب زندہ رہا ہے؟ بھلا تمہارے بغیر میری زندگی موت نہیں تو اور کیا ہوگی؟"

" نہیں آصف! یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس وقت تک تو جینا ہوتا ہی ہے جب تک زندگی ہے چاہے کوئی اور ساتھ ہو یا نہ ہو..... ہاں محرومی کا شدید احساس ضرور ہوتا ہے۔"

" ارے نہیں شازیہ! یقین جانو مجھے تو تم سے ایسی محبت ہے کہ اگر تم میری زندگی میں نہ آئیں تو شاید ہی زندہ رہ سکوں۔"

" ایسا نہ کہو۔تمھیں کیا خبر کہ مجھے صرف تمہاری زندگی کی ضرورت ہے۔میری زندگی ادھوری اور مایوس کن ہے۔تمھیں تو میں اپنی زندگی دے کر بھی حاصل کرنا چاہوں گی۔"

" اور تم جب میری ہو جاؤ گی تو میں اپنی آغوش کو اتنا کشادہ کر سکوں گا کہ تمہارا ہر غم، تمہاری ہر اداسی اور تمہاری ہر پریشانی اس میں سما جائے۔تمہارے لئے دنیا کے ذرّے ذرّے کو بہار آفریں بنا دوں گا تاکہ تمہارا قدم قدم پر بہار ہو۔کیا تم میری محبت سے خوش نہیں ہو؟"

آصف نے شازیہ کو اداس اور چپ چپ دیکھ کر سوال کیا۔

" تمھیں کیا خبر آصف! خوشیاں میرے نصیب میں بھی ہیں یا صرف ان کے بارے میں سوچ سکتی ہوں۔خوشیاں تو میں دوسروں کو بھی دیتی ہوں اور اس طرح مجھے خوشی ہوتی ہے مگر جب میں تمہاری خوشیوں کے لئے سوچتی ہوں تو اپنی روح کو رقص کرتے ہوئے محسوس کرتی ہوں جیسے کائنات کی ہر خوشی میرے قدموں پہ نچھاور ہو رہی ہو...... سچ کہو آصف! کہیں یہ صرف میرا خواب یا تصور تو نہیں ہے؟ کہیں یہ خواب اور یہ تصور بکھر کر ریزہ ریزہ تو نہ ہو جائے گا؟ مجھے تو اب کچھ سوچتے ہوئے بھی کبھی کبھی بڑا خوف سا لگتا ہے۔" شازیہ کے چہرے پر گہری اداسی چھا گئی اور وہ آصف کو حسرت بھری نظروں سے تکنے لگی،

" نہیں شازیہ! تم نہ ایسا سوچو اور نہ ایسا کہو۔میں تمہارے ہر غم کو اپنا کر تمھیں خوشیاں دوں گا۔ تمہارے خواب اور تمہارے تصور کو جیتی جاگتی حقیقت میں تبدیل کر کے دکھاؤں گا۔میں آج ہی اس

بارے میں اپنی ماں سے بات کروں گا۔ چاہے مجھے کتنی بڑی قربانی کیوں نہ دینا پڑے تم میری ہو کر رہو گی۔"

آصف نے فیصلہ کن انداز میں شانزیہ کو تسلی دی اور وہ پھر کچھ نہ کہہ سکی۔

گھر میں تین دن سے ایک طوفان سا اٹھا ہوا تھا ایک ایسا حشر بپا تھا جس نے آصف اور شانزیہ کی روحوں کو زخمی کر دیا تھا۔ ایک طرف دنیا کے رسم و رواج دوسری طرف آصف اور اس کی ضد۔ اس نے جو کچھ طے کر لیا تھا اس کی خبر گھر والوں کو ہو گئی تھی لیکن گھر والے بار بار یہی رٹے جا رہے تھے کہ اگر آصف نے رضیہ سے شادی نہ کی تو اس کی اپنی بہن کا گھر اجڑ جائے گا اسے طلاق مل جائے گی۔ بہن کی شادی ہوئی ہی اس شرط پر تھی کہ اس کی نسبت رضیہ سے پکی کر دی گئی تھی اور اب ہر حال میں اسے رضیہ سے شادی کرنا تھی۔ یہ رواج صدیوں سے چلا آ رہا تھا کہ خاندان کی بیٹیوں کا رشتہ خاندان سے باہر نہیں ہو سکتا۔ چاہے زمین پھٹ جائے اور آسمان ٹوٹ پڑے پھر بھی اس فرسودہ رواج میں فرق نہیں آ سکتا۔

"خدایا! یہ کیسی دنیا ہے جہاں کے رسم و رواج، زندگی سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کیسی خود غرضی ہے جس میں اپنی حالت پر ماتم کرنے کی بھی اجازت نہیں۔"

آخر آصف نے ظالم دنیا کے ظالمانہ رسم و رواج کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ کسی کی معصوم زندگی کا شیرازہ موتیوں کی ٹوٹی ہوئی لڑی کی طرح بکھر گیا۔ وہ خوشگوار فضا جس میں تبسم اور قہقہوں کی رعنائیاں بکھرنے لگی تھیں اب آہوں اور فریادوں کی ہلکی ہلکی آوازوں سے بوجھل ہو گئی۔

ثمیرہ زریں

رَستے بادل

وہ متلاشی نگاہوں سے ہر مہمان کو خوش آمدید کہہ کر مناسب جگہ پر بٹھاتا اور پھر کسی خوشگوار امید پہ دروازے کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا۔ پروگرام شروع ہونے میں چند منٹ ہی باقی رہ گئے تھے اور تقریباً سب ہی مہمان آچکے تھے ... لیکن سوائے اس کے ....

اسٹیج کے سامنے والی پہلی قطار ایران کے ثقافتی وفد کے مندوبین کے لئے مخصوص تھی مگر دوسری قطار میں اُس نے میجر اور میجر کے اہل و عیال کے لئے بھی نشستیں رکھی تھیں۔

اناؤنسر لڑکی مس نوشابہ ساڑھی کا پلّو سنبھالتی جب مائک کے قریب پہنچی تو وہ بھی دروازہ چھوڑ کر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔

ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اس کو دعوت نامہ نہ ملا ہو کیونکہ اس نے بذات خود کارڈ پہ جاکر اپنے ڈرائیور کے ہاتھ سے کارڈ بھجوایا تھا۔

نیچ لکژری ہوٹل میں شام ہمیشہ کی طرح دل فریب تھی۔ آرکیسٹرا پر فاکس ٹراٹ کی دھنیں بج رہی تھیں وسیع و عریض ہال میں ہر میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیاں چارمنگ لڑکیوں اور اسمارٹ لڑکوں سے بھر گئی تھیں۔

وہ کچھ اداس ہو گیا۔ سارا پروگرام اس کی آنکھوں کے سامنے کچھ اس طرح بے کیف گزر گیا جیسے اُسے کسی سے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔ نہ تو اسے کسی ڈانسر کی حرکات و سکنات میں کوئی جاذبیت نظر آئی نہ کسی گلوکار کے پکے راگ میں کوئی کشش محسوس ہوئی ہاں جب مصری خاں نے الغوزے پر رانو سنایا تو اسے ایسا لگا جیسے مومل کی بیقرار و مضطرب روح آج اس کی رگ رگ میں سما گئی ہے۔

جب سے وہ اس کلب کا سکریٹری ہوا تھا تب سے دوسرے کئی پروگرام بنانے اور پیش کرنے کے علاوہ دعوت ناموں میں یہ تبدیلی اس نے خود کی تھی کہ جہاں پہلے صرف مسٹر اور مسز کے لفظ

پچھتے تھے وہاں اس نے مس (Miss) کا اضافہ بھی کر دیا تھا۔

جن افسروں کے گھروں میں مسوں (Misses) کی تعداد زیادہ ہوتی انھیں پروگرام کے دعوت نامے سب سے پہلے ملتے۔ رضوان تو بذاتِ خود اسکوٹر پر جاکر انھیں کارڈ پہنچاتا تھا بقول اس کے کالج کی بہ نسبت کلب کے معزز ماحول میں رومانس کی خوشبو دوسری قسم کی ہوتی ہے۔

جب یہ اسمارٹ دوشیزائیں زرق برق چُست اور پرکشش لباس میں پروقار انداز سے قدم رکھتی ہوئی داخل ہوتیں اس وقت جاوید اِدھر اُدھر آتے جاتے ان کی ممی اور ڈیڈی کو ایک دو لطیفے سنانا اپنا فرض سمجھتا جن کو سن کر وہ ہنس دیتے اور وہ خود کلیوں کی طرح محتاط مسکراہٹیں بکھیر دیتیں رضوان بیرے کو بہترین ڈشز (DISHES) لانے کا آرڈر دیتا اس لئے سب کی طرف سے اُسے کچھ تعریف و توصیف کی سوغاتیں مل جاتیں۔

"جاوید پڑھنے میں جتنا ہوشیار ہے اتنا ہی سوشل بھی ہے اور ہنس مکھ تو ایسا کہ کیا مجال جو اس کا ایک جملہ بھی مذاق سے خالی ہو۔" مسٹر سہیل اپنی بیگم کو بتاتے اور وہ بڑی خوش دلی سے بات آگے بڑھاتیں۔ "ضرور ایم۔اے کرنے کے بعد کسی کو پرپوز (PROPOSE) کرے گا۔ واقعی اس کی ہونے والی بیوی بڑی خوش نصیب ہوگی۔ بڑا اور مالدار گھرانا ہے اور ملکیت بھی اتنی کہ ایک لاکھ کا۔ تو ہر وقت یہی دوڑاتا پھرتا ہے۔"

اس وقت مسز سہیل کے آئینہ خانۂ تصور میں ان کی اپنی بیٹی کا نقش پوری آب و تاب سے اُبھرتا۔

مسز عابد کہتیں۔ "میں تو آج آ ہی نہیں رہی تھی مگر رضوان نے بہت اصرار کیا۔ کہنے لگا آنٹی! گھر بیٹھ کر آخر کیا کرو گی؟ دل بہل جائے گا۔ اور اب آئی تو اتنے لوازمات نظر آئے کہ مجھے تو اب رات کے کھانے کی بھی طلب نہ رہی۔"

مسز عابد ویسے ہی خوش خوراکی میں خاصی مشہور تھیں اور رضوان اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی فارورڈ تھا۔ رسم و راہ کے چند دن بعد اس کے اسکوٹر کی پچھلی سیٹ پر کوئی نہ کوئی 'چارمنگ گرل' بیٹھی ہوتی جسے وہ بینچ کول کے پرسکون ماحول میں آئس کریم اور اسکواش کھلا پلا کر پورے مہینے کی پاکٹ منی ختم کر ڈالتا — جاوید اس حد تک تو نہ پہنچا تھا مگر آج اس نے خود اپنی کار پر جاکر نازؔ کو کارڈ پہنچایا تھا جو اس طرح بیکار گیا کہ نہ وہ خود آئی اور نہ میجر اکبر ہی آئے جن سے وہ اس کے بارے میں کچھ معلوم کرسکتا۔

جاوید کو خوب صورت لڑکیاں بس اس حد تک پسند تھیں کہ وہ انھیں دیکھے اور بولے چالے مگر رضوان کی طرح کوئی تاریخ اور وقت مقرر کرنے کا قائل وہ نہیں تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ جس طرح گلوں کا حسن متاثر کرتا ہے اسی طرح خوب صورت لڑکیوں کا ہجوم۔ لیکن زیادہ آگے بڑھنا گویا خود کو کانٹوں میں الجھانا ہے" اف! یہ آج کی لڑکیاں؟ ہر ایک اپنے آپ کو ڈالنہ، ہتھ ٹیلر، اور جینا لولو بریجیڈا سمجھنے لگی ہے"۔ وہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کہتا پر آج نہ جانے کیوں وہ ناز جیسی معمولی لڑکی کی کمی پورے ہال میں کسی سے بھی پوری نہ کر سکا تھا۔

اُسے گم صُم دیکھ کر پروفیسر مسز ثریا عزیز چہکیں "۔ کیوں کیا آج گھر سے آتے ہوئے کچھ بھول آئے ہو؟"

"جی ۔۔۔۔ نہ ۔۔۔۔ وہ رزلٹ کا خیال ہے"۔ اس نے کچھ اٹک اٹک کر جواب دیا۔

"اطمینان رکھو۔۔۔ فیل نہ ہوگے اور کم سے کم یہاں تو یہ فکر کرنا ہی نہ چاہیئے"۔ ثریا نے مسکراتے ہوئے تسلی دی۔

دوسرے دن جب اس نے رضوان کو فون کرنے کا ارادہ کیا تو دفعتاً اسے کچھ خیال آیا اور ڈائل گھما کر اس نے میجر اکبر کا فون نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف سے بڑے میٹھے سُروں میں دھیمی دھیمی آواز آئی جیسے Ass کی میوزک "یس پلیز"۔ "کیا تم ناز ہو"۔ اس نے جلدی سے پوچھا "جی۔ آپ کو کس سے بات کرنا ہے"۔ "جی! میجر صاحب سے (وہ جھوٹ بولا) اور ہاں آپ لوگ کلچرل شو میں کیوں نہ آئے"۔ "بس یونہی"۔ "آج کلب آؤ گی"۔

"دیکھا جائے گا۔ اچھا میں میجر صاحب کو آپ کا پیغام دیتی ہوں"۔ وہ رسیور میز پہ رکھ کر چلی گئی۔

"بد دماغ" اس نے سوچا اب اس جرم کی سزا میں اُسے ناحق میجر جیسے سودائی سے ایک دو منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا پڑیں گی۔ "آپ کو کل مسٹر سہیل بہت یاد کرتے رہے ــ اور وہ آپ کے پارسی دوست مسٹر امروز کو تو بغیر آپ کے ڈرنک کرنے میں کوئی لطف ہی نہ آیا"۔

میجر سے جان چھڑا کر وہ سخت بوریت میں یونیورسٹی چلا گیا۔

جاوید نے ناز کو کلب میں دیکھا تھا وہ میجر کے قریب صوفے پر چُپ چاپ بیٹھی طائرانہ نگاہ سے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔

میجر کے گھر میں عورت سرے سے ناپید تھی۔ اس کی بیوی کو مرے ہوئے مدت ہو چکی تھی ایک لڑکا تھا وہ بھی ٹی۔ بی کا مریض سو زیادہ تر گھنیا گلی کے سینی ٹوریم میں رہتا۔ آج اس کے پاس کونج جیسی نازک اور مورنی جیسی باوقار لڑکی کو دیکھ کر جاوید کو حیرت ہوئی۔ میجر کے پاس والی دو کرسیاں خالی تھیں موقعہ غنیمت جان کر وہ میجر کی رسمی اجازت طلب کر کے وہاں جا بیٹھا اور میجر نے ناز کو اس سے متعارف کیا۔ "یہ میری بھتیجی ہے۔ بی۔ اے میں پڑھتی ہے اور یہ ہیں مسٹر جاوید (S.E) سعید قریشی صاحب کے صاحبزادے اور اس کلب کے سکرٹری۔"

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" جاوید نے سالوں پرانا یہ گلا سڑا جملہ دہرایا۔

"ناز نے سر کو خفیف سی جنبش دے کر قدرے مسکرا کر اس واقفیت کا خیر مقدم کیا پھر وہ میجر سے گفتگو کرتا رہا اور ناز ایسی بے نیازی سے چپ بیٹھی رہی جیسے اس کے سوا وہاں کسی اور کا وجود ہی نہ تھا۔

جب میجر اکبر ڈرنک کرنے کے لئے مسٹر امروز کی میز پر چلا گیا تو جاوید نے پوچھا "بی۔ اے کرنے کے بعد کیا خیال ہے"۔ "فی الحال تو میں نے کچھ نہیں سوچا" ناز نے روکھا سا جواب دیا۔

ریکارڈ پلیئر پر ایتھل اسمتھ کی ٹیکو ٹیکو میمبو (TICO, TICO MAMBO) والی دھنیں گونج رہی تھیں۔ اس کے پیر ڈانس کے لئے مچلنے لگے۔ کافی ممبر ڈانس فلور کی طرف چلے گئے۔

"آپ کو ڈانس سے دلچسپی ہے؟" جاوید نے اسے پارٹنر بنانا چاہا۔

"جی نہیں"

"گانے سے تو ہوگی"

"جی نہیں" ــــ "پھر آخر کونسی ہابی ہے آپ کی" ــــ "کیا آپ میرا انٹرویو لے رہے ہیں"

لہجہ سخت تھا پر جاوید کو شبنم سے بھیگے ہوئے گلابوں کی طرح ملائم لگا۔

"آپ کو میرا پوچھنا ناگوار گذرا؟"

"بالکل نہیں۔ پر آپ کو میرے بارے میں یہ معلومات آخر کیا فائدہ پہنچائیں گی؟"

"مجھے یہ خبر نہ تھی کہ آپ بات چیت کو بزنس سمجھ کر فائدے اور نقصان کے پیمانے سے ناپتی ہیں"

جاوید کا موڈ کچھ خراب سا ہو گیا اور ناز بے نیازانہ طور پر مسکراتی رہی۔ وہ "ایکسکیوزمی" کہہ کر وہاں سے

چلا گیا۔ بعد میں کلب سے واپسی پر رضوان نے اسے بتایا کہ "آج کلب میں میجر کی خوشبو بھری نوخیز کلی سب کی گفتگو کا مرکز بنی رہی۔"

"ہوں! ... پر وہ تو سخت بد دماغ ہے۔" جاوید نے اپنی روداد بیان کی۔

"خوب صورت لڑکیاں ایسی بدخو تو نہیں ہوا کرتیں۔" رضوان نے اپنا تجربہ دہرایا۔

"ہوتی ہیں یا نہیں؟ پر انھیں ایسا ہونا نہ چاہیے۔" جاوید نے ہنس کر بات کو ٹالا۔

"کوشش جاری رکھو۔ آخر بچ کر کہاں جائے گی۔" رضوان نے دلداری فرمائی۔

"دفن کرو ڈیئر! کارِ جہاں تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست۔" جاوید نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔

ایک ہفتے کے بعد جب رضوان نے یوم انقلاب کے موقعہ پر بڑی شاندار گارڈن پارٹی کا اہتمام کرایا تو جاوید نے خود اپنی کار پر جا کر حسب معمول ڈرائیور کے ہاتھوں ناز کو اس پارٹی کا کارڈ پہنچوایا مگر وہ نہ آئی۔

دوسرے دن وہ کلب نہ گیا۔ رضوان نے اُسے فون پر بتایا کہ "ناز آئی ہے سلیٹی ساڑھی میں بالکل ایسی جیسے خوب صورت کبوتری"۔ لیکن جاوید پھر بھی کلب نہ گیا یہ بات الگ ہے کہ وہ گھر پر بڑی بے کیفی محسوس کر رہا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ یہ عہد کر کے کلب گیا کہ اگر ناز وہاں ہوگی بھی تو وہ اس سے قطعی بات چیت نہ کرے گا لیکن اس شام کلب پہنچتے ہی جب ناز نے بذات خود بات چیت میں پہل کی تو وہ جان بوجھ کر اپنے عہد سے پھر گیا۔

آرکسٹرا کی تیز دُھنوں پر رقص کرنے والے جوڑے جھوم جھوم کر ناچ رہے تھے۔ پروفیسر ثریا عزیز اپنی آدھی عمر کے برابر والے ایک نوجوان کے ساتھ ٹوسٹ ناچ رہی تھی (نوجوان وزن میں بھی اس کا آدھا ہی ہوگا) ناز ایسی موٹی عورت کو ٹوسٹ میں مگن دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی۔" ایسا بے ہنگم ناچ دیکھ کر مجھے قدیم غاروں کا زمانہ یاد آتا ہے جب انسان اپنی خوشی اور مستی کا اظہار ایسے جنگلی طریقوں سے کرتے تھے۔"

" اور تمھیں دیکھ کر مجھے یونان کی مغرور دیویاں یاد آتی ہیں۔" جاوید نے لائٹر جلاتے ہوئے کہا۔

"جنھیں کسی دیوتا کی دعا نے پتھر بنا دیا ہو۔" نازؔ نے بڑے اداس لہجے میں آہستگی سے اس کی بات کو پورا کیا۔ اس نے لالٹین کے شعلے کی اوٹ میں نازؔ کی کنول جیسی آنکھوں کو دیکھا جن میں اداسی کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ "تم دنیا سے اتنی بے نیاز کیوں رہتی ہو نازؔ؟" جاوید نے کچھ عجب سے انداز میں سوال کیا۔ "شاید نازؔ کے سبب۔" وہ ہنس کر بات کو ٹال گئی۔

کچھ دنوں کے بعد کلب میں پھر ایک خاص پروگرام تھا۔ اس مرتبہ نازؔ کو دعوت نامہ بھیجتے ہوئے جاوید نے اس کے ایک کونے پر لکھا۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔

شام کو جب وہ آئی تو جاوید نے بڑی بے صبری سے پوچھا "کارڈ ملا؟"

"ہاں جناب! ایسی خصوصیات والا کارڈ کیوں نہ ملتا۔"

"تو پھر......"

"ویران گھر کے لئے صفائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔" نازؔ نے رسان سے کہا۔

جاوید کو اپنا دل بلیوں اچھلتا ہوا محسوس ہوا۔

"میں نہیں سمجھا۔"

"بس اب اس ناسمجھی کو کیا کہا جائے...... میں نے تو دل دے کر تم سے عہد بھی لے لیا اور تم کو کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔"

جاوید کی آنکھوں میں شرم اور شرارت کی ملی جلی کیفیت ابھر آئی اس نے خوشی میں نازؔ کا ہات اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

کوئٹہ کا نابینا ریڈیو سنگر بڑی محویت کے عالم میں پشتو گیت گا رہا تھا۔ جاوید نے پوچھا۔

"تم یہ گیت سمجھ رہی ہو؟"

"نہیں مجھے پشتو بولی نہیں آتی۔"

"میں اس کا مطلب بتاؤں؟..... مجھے میرے ایک پٹھان دوست نے بتایا تھا۔ راہِ حیات بڑی کٹھن ہے۔ بیحد دکھی اور تنہا تنہا۔ کیا تم تھوڑی دور میرا ساتھ نہ دو گے؟۔ تمام عمر کون کس کا ساتھ دیتا ہے۔ میں اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوں پھر بھی کہتا ہوں کیا تم میرا ساتھ نہ دو گے؟"

نازاندھیری راہوں میں بھٹکنے والے نابینا راہی کا گیت اور جاوید سے اس کے معنی بڑے غور سے سنتی رہی اور جب گیت ختم ہوگیا تو اس نے اک آہ سرد بھری "تھوڑی دور ساتھ دینے کے معنی سوائے اس کے اور کیا ہیں کہ زندگی کے ہر موڑ پہ یہ ساتھ پیر پکڑے پیچھے دیکھنے پر مجبور کرتا رہے۔"

جاوید اس کے مہکتے بالوں کی چھاؤں سے سرگوشی کرتے ہوئے بولا "نازؔ! میں اس کا قائل نہیں ہوں مجھے تو زندگی بھر کا ساتھ درکار ہے۔"

نازؔ کی آنکھوں میں اچانک ایک چمک سی آئی اور پھر گم ہوگئی اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ جاوید کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

ایک شام وہ دونوں کلفٹن کی سیر کر رہے تھے وقت بڑی تیزی سے گزرتا گیا سمندر کا شور آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ وہ پتھر کی ایک بنچ پر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ ناز خاموش تھی یہ کوئی نئی بات نہ تھی وہ اکثر ہنسی ہنسی میں ہی اداس ہو جاتی ہے۔

"نازو! او نازیو!!"

"ہوں۔"

"تم اتنی اداس کیوں ہوگئیں۔"

"ایسے ہی۔"

"تمھیں ستاروں بھرا آسمان پیارا لگتا ہے یا چاندنی۔"

"دونوں۔"

"مجھے صرف اماوس کی اندھیری اور ستاروں کی چمک" جاوید نے آسمان کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اور اوپر آسمان کے بیکراں اندھیرے میں لاکھوں چراغ روشن تھے۔ "ستارے بیشک حسین ہیں لیکن تمھاری آنکھوں سے کم۔"

"واہ کیا حسن ظن ہے ذرا پھر تو کہو۔" وہ اس مذاق پر ہنس دیا۔ "سچ جاوید! ستاروں کی آنکھوں میں میرے لئے اتنا پیار کہاں جتنا تمھاری آنکھوں میں ہے۔" ناز نے اداسی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

" اور تمھاری آنکھوں میں میرے لئے ؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں ۔" اس نے ذرا جھک کر ناز کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا لیکن اس نے اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کو ڈھک لیا اور پھر جب ہاتھ ہٹائے تو ہاتھوں پہ بھی نمی تھی اور آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں ۔"

" آساجن نینن بیں پلک ڈھانپ توہے ہلوں
نا میں دیکھوں اور کو نا توہے دیکھن دوں !"

اس نے بڑی پرسوز آواز میں یہ دوہا پڑھا۔

واپس لوٹتے ہوئے جاوید نے پوچھا۔" کل تاج ہوٹل چلوگی ؟ مصر کی بیلے ڈانسرز آئی ہیں۔"

" نہیں کل تم میرے گھر آؤ ۔"

" کوئی خاص کام ہے ؟"

" ہاں بیحد ضروری ۔"

" تو ضرور آؤں گا"۔ مگر وہ نہ جاسکا اور اس کا نہ جانا اتنا اہم بھی نہ تھا لیکن ناز اس کے بعد پھر کبھی کلب میں نہ آئی۔ ایک ہفتے تک تو وہ اس کی غیر موجودگی کو برداشت کرتا رہا پر رفتہ رفتہ اس کی بیقراری بڑھتی گئی۔ اس نے کئی مرتبہ فون کیا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ اُسے بیحد تعجب اور شدید افسوس ہو رہا تھا کہ ناز اتنی معمولی سی بات پر اس قدر ناراض کیونکر ہو سکتی ہے۔ وہ ایسی ہلکی طبیعت کی تو ہرگز نہیں ہے یا ہو سکتا ہے کہ اس کے نزدیک میرا اس کے گھر جانا انتہائی ضروری ہو۔

وہ اسی پس و پیش میں سرِ شام ہی سے اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔ نیلے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی میں CHA CHA NO TICKO - NO کی دُھن نے اس کو کچھ اور زیادہ بیقرار کر دیا۔ اُسے ہمیشہ یہ دُھن سن کر صحرا میں چھٹکی ہوئی چاندنی کا خیال آتا تھا جہاں کوئی خانہ بدوش اپنے خیمے میں تنہائی کے احساس کو بہلانے کے لئے اپنی محبوبہ کے سامنے مخمور ہو کر رباب کے تاروں کو چھیڑ رہا ہو۔ وہ ناز کے تصور میں اور زیادہ اداس ہوتا گیا۔

کلب میں اس نے مسٹر امروز کو اکیلے ڈرنک کرتے دیکھ کر پوچھا۔" کیوں آج میجر اکبر نہیں آئے ہیں کیا ؟" اور امروز نے ایک خندۂ دنداں نما کے بعد بڑی بے اعتنائی سے کہا۔" میجر کو یہاں نہ آئے تو اُتنے ہی دن بیت چکے ہیں جتنے ناز کو۔ یہ دوسری بات ہے کہ تم نے میجر کی

کمی آج محسوس کی۔"

وہ اُداسی سے مسکرا دیا اور رامروز نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا "میجر اکبر ناز کو لے کر اپنے بیٹے کے پاس نتھیا گلی گیا ہے۔ ڈاکٹر نے تار دیا تھا کہ اس کا بیٹا اب صحتمند ہے۔ میجر نے مجھے بتایا تھا کہ آئندہ مہینے ناز سے اُس کے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے۔"

"سینی ٹوریم میں رہے ہوئے مریض سے اس طرح شادی کر دینا تو درست نہیں ہے۔ کچھ دنوں تک اسے اپنے بیٹے کی صحت پر نظر رکھنا چاہیے تھا۔"

رضوان نے سگریٹ کیس سے کھیلتے ہوئے کہا "ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر میجر جیسا لالچی ناز کی ملکیت سے کیسے دست بردار ہو سکتا ہے۔ بیچاری کا کوئی اور رشتے دار ہوتا تو یہ رشتہ ٹوٹ سکتا تھا تنہا لڑکی کیا ضد کر سکتی ہے۔"

جاوید کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے صحرا میں چاندنی غائب ہو چکی ہو اور اُفق کے اس پار سے سورج تند و تیز کرنوں کے بھالے اٹھائے نمودار ہو رہا ہو مگر ابھی تک کوئی نا سمجھ اُسی دُھن میں اپنے خیمے میں بیٹھا بڑی بیقراری سے رباب بجا رہا ہو۔

شیشے کے چوکور چمکدار دروازوں سے نکل کر وہ باہر آیا تو آسمان پر ستاروں کی آنکھ مچولی ویسی ہی شوخ اور دلفریب تھی جیسی کچھ دنوں پہلے کلفٹن کے کنارے پر جہاں کسی کی آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے نیلے آکاش سے زیادہ حسن اور کشش نظر آئی تھی۔

پر آج؟ آج اس کی آنکھوں میں کیا تھا؟ شاید کچھ جلن اور شاید کچھ نمی۔

شیخ ایاز

سامراجیوں سے ....

اب بہت دن سے یہاں
شیر ہے کوئی نہ اس کی گھن گرج
یہ بھی کیا کم ہے کہ کوئی سہما سہما جاندار
بول اٹھتا ہے کہیں سے ناگہاں

ہاں کبھی تو یہ رُکے بادل برس ہی جائیں گے
اور گرجتی گونجتی مخلوق آندھی کی طرح
جس طرف بڑھتا ہے بڑھتی جائے گی
دیکھنا ان ناتواں ہاتھوں کے ہاتھ
توڑ دیں گے ہر کڑی زنجیر کی

جن میں ہے خوں ریز اشکوں کی قطار
ہوں گی وہ آنکھیں اچانک شعلہ بار
ان کی گہرائی کا اندازہ تمھیں ہو جائے گا
جب بھی اس خاموش سطحِ آب پر
کوئی طوفاں آئے گا

تم تو بہرے ہو مگر میں سن رہا ہوں آہٹیں
آہٹیں افتاں و خیزاں بجلیوں کی آہٹیں
تم تو اندھے ہو مگر میری نظر
دیکھتی ہے ان تڑپتی بجلیوں کو سر بسر

تیرگی کو اپنا کاشانہ بنائے
بیٹھے ہو انجان بن کر منہ چھپائے
وقت اِک ایسا بھی آئے گا ضرور
رن میں جب ہو گا ہمارا سامنا
ہو گی پھر جنگی رتھوں کی ریل پیل
کامراں ہوں گے ہمارے حوصلے
پس کے رہ جاؤ گے تم گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے

جانتا ہوں اور میرا جاننا
ایک چنگاری کی دھیمی آنچ ہے
لاوا بن کر پھیل جائے گی کبھی جو ہر طرف
جل اُٹھے گا یہ جہانِ پُر فریب
جو تمھارے ظلم کی تخلیق ہے

بس یقیں کر لو یہی انجام آخر کار ہے
جیت ہماری اور تمھاری ہار ہے
آگ کے جلتے ہوئے شعلوں میں جب
راکھ ہو جاؤ گے تم
پھر سے یہ شعلے جنم دیں گے نئے انسان کو

شیخ ایاز

رقصِ شرر

اس کا مول نہ پوچھ اے آمر!
اس کے گیت خرید سکے گا؟

آج تری دہلیز پہ ہر سو
بھک منگوں کا شور بپا ہے
جو کوڑی کے بھاؤ نہ بکتا
لعل و گہر کے مول بکا ہے

بارشِ سیمیں تیرا تبسم
کاسۂ رخشاں دستِ گدا ہے
علم و ادب بازارِ کنیزاں
حسن برہنہ عشوہ نما ہے
دولتِ دانش، جرأتِ بینش
فکر کہ فن ہو سب کی بہا ہے
تیرے دیارِ دام و درم میں
اک شاعر کی قیمت کیا ہے
لیکن تو نے آمرِ ناداں!
چاروں اور، کبھی دیکھا ہے؟
سندھ کہ اک دریائے خوں ہے
نبضِ تپانِ دشتِ وفا ہے
اس کی وادیٔ گریاں میں اب

اک ایسا بھی شعلہ نوا ہے
جس کی صدائے بانگِ جرس پر
ایک انوکھا رقص بپا ہے
زنجیروں میں، ناخنِ پا پر
اک طرفہ سا رنگِ حنا ہے
رسمِ تپیدنِ خاک و خوں سے
اس نے جب بھی شعر پڑھا ہے
ایوانوں میں دھول اڑی ہے
شہرِ سلاسل کانپ اٹھا ہے
گیت گرجتا نعرہ بن کر
بستی بستی پھیل گیا ہے
موہن جو دارو کی دھرتی
آج لپکتا سا شعلہ ہے
یہ شعلہ جس رقصِ شرر کی
ایک تحیّر خیز ادا ہے
اس کا نام نہ پوچھ اے آمر!
اس کے گیت خرید سکے گا؟

شیخ ایاز

حیدر آباد

یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں
یہ تو حیدر آباد کا شہر ہے
اس کی گلی گلی میں خون کی نہریں کہاں سے آئیں
وہ دیکھو ہر ہوا دان سے
لہو کے فوارے آسمان کی طرف ابھر رہے ہیں
میں نے ایسی گھنگھور گھٹائیں تو پہلے کبھی نہیں دیکھیں
یہ لہو سے لال گھٹائیں جو احمریں رنگ برسا رہی ہیں
وہ سورج ہے ؟
یا آسمان کا زخم کہنہ رسنے لگا ہے

یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں
وہ گھنگھور گھٹائیں کہاں گئیں ؟
وہ خون کی نہریں کہاں ہیں ؟
وہ زخم کہنہ کہاں چھپ گیا ؟
یہ بادِ بہاری کہاں سے آرہی ہے ؟
ارے یہ کاک[1] تو پھر احمریں ہونے لگی
وہ دیکھو ہوشو شیدی[2] کے مزار پر انار کے پھول کھلے ہیں

---

[1] کاک۔ سندھ کی وہ ندی جس کے کنارے مُومَل نے اپنا طلسمی محل بنوایا تھا۔
[2] ہوشو شیدی۔ ایک سندھی جانباز جو میانی کی جنگ میں مرتے دم تک انگریزوں کے خلاف لڑتا رہا

شیخ ایاز

بھور بھئی اور پنچھی جاگے
اجیارے نے انگڑائی لی
اوس میں بھیگی کلیاں جاگیں
نیند میں ڈوبی گلیاں جاگیں
گائیں جاگیں، گوالے جاگے
دھرتی کے رکھوالے جاگے

اب کرنوں کی باگیں تھامے
پورب کا رتھوان بڑھے گا
اور جیون کی بھن بھن تانیں
دن بھر کانوں میں گونجیں گی
چاند کے چرنوں میں ہی میں نے
گاتے ساری رین گذاری
دنیا سوئی اور میں جاگا
دنیا جاگی میں سو جاؤں
اب تو دنیا پہ سر رکھ کر
میٹھے سپنوں میں کھو جاؤں

اب تم میرے گن اور اوگن
بیرن دھرتی بھول ہی جاؤ
مٹی سے کیا بیر رکھو گی
میرے گیتوں کو اپناؤ
یا ٹھکراؤ ہا میری بلا سے
میں نے تم کو معاف کیا ہے
اب میں چین سے سو جاؤں گا

(تصنیف و ترجمہ)

شیخ ایاز

اے سوال پر خطر
اے پرانے نقب زن !
کتنے برسوں تک لگائی تو نے سیندھ
لیکن اس دیوارِ لب میں
کر نہ پایا اِک شگاف
چھوڑ دے فکرِ گرفتاری نہ کر
ڈھا بھی دے یک لخت اِس دیوار کو
اس مسلسل جانکنی کو ختم کر
بے کلی کو ختم کر
خامشی کو ختم کر !

(تصنیف و ترجمہ)

شیخ ایاز

بھور ہوئی ہے
آک کے نیلے پھول کھلے ہیں
سوکھی ہوئی دھرتی کی آنکھیں کتنی آس لگائے
دیکھ رہی ہیں ساون رت کی آنے والی گھٹاؤں کو
تپتے ہوئے رن کی دھرتی پہ چھانے والی چھاؤں کو
ان پھولوں کی موہنی آنکھیں کتنی سندر لگتی ہیں
سب کے من کو ٹھگتی ہیں
کس نے دیکھا برسوں کا بس ان کی نیلی نس نس میں
کس نے سوچا سورج ان پہ کب تک بان چلائے گا
کرنوں کو برسائے گا
پاگل ہے پچھتائے گا
اپنا کس بل کھوئے گا
آخر ڈوب ہی جائے گا
وہ کیا جانے
زہر میں ڈوبی نیلی آنکھیں دھوپ میں کب کملاتی ہیں

(تصنیف و ترجمہ)

شیخ ایاز

آج پھر پُروا چلی
پھر جُگوں کی پریت یاد آنے لگی[1]
مَیں تجھے پھر ڈھونڈتا ہوں اُروشی،
مَیں کہ وکرم بھی ہوں کالیداس بھی
آج پھر تیرے لئے بیچین ہوں
تیرے بالوں کی سگندھوں سے پرے
میں کویتا لکھ تو لیتا ہوں مگر
اس تعفن سے بھری دُنیا پہ میں
چادرِ مشکیں سجاؤں بھی تو کیا ؟
پریت کے کچھ گیت گاؤں بھی تو کیا ؟
ہائے کتنی تیز ہے بوئے کفن
ہائے کتنا تنگ ہے کوئے وفا
کاش مجھ کو چھوڑ کر جاتی نہ تو
مجھ سے ناتا توڑ کر جاتی نہ تو

(تصنیف و ترجمہ)

---

[1] کالی داس کے ڈرامہ وکرم اروشی کی طرف اشارہ ہے۔

شیخ ایاز

کیا تم میرے ساتھ چلو گے ؟
سورج جب تپ جلئے گا تب ایک چتا میں ساتھ جلو گے
میری عمریا بیت گئی ہے
مجھ کو تو کانٹے ہی ملے ہیں
لیکن میں نے مان لیا ہے
اس بگیا میں لال بھبھو کے پھول کھلے ہیں
کٹھن ڈگر پر کیسی چھاؤں
لہولہان ہیں میرے پاؤں
پھر بھی میں بڑھتا جاتا ہوں
دیکھو کیسی چٹانوں پر میں دھیرج سے چڑھتا جاتا ہوں
اب تو پہاڑوں کے پیچ وخم میرے لئے انجانے نہیں ہیں
اور اکیلے پن کے سب غم میرے لئے بیگانے نہیں ہیں
اے پردیسی تم رستے میں آن ملے ہو
میری طرح تم بھی وہ بگیا ڈھونڈ رہے ہو
جس میں کروڑوں لال بھبھو کے پھول کھلے ہیں
میری عمریا بیت گئی ہے
مجھ کو تو کانٹے ہی ملے ہیں
کٹھن ڈگر پر کیسی چھاؤں
اور نازک ہیں تیرے پاؤں
کیا تم میرے ساتھ چلو گے ؟
سورج جب تپ جائے گا تب ایک چتا میں ساتھ جلو گے

(تصنیف د ترجمہ

شیخ ایاز

(ترجمہ آفاق صدیقی)

مشعلِ اُمّید

زندگی کے جال میں
کتنی ہی خوشیاں اچانک آ گئیں
خوب ناچیں اور تڑپ کر مر گئیں
پیار کی کیا کیا امنگیں نت نئی خوشیوں میں تھیں
اس بھری دنیا کی ہر شے بے ثبات
موت سے بچ کر رہی ہے کس کی ذات
پھر بھی پیاری ہے ہمیں یہ کائنات

کون کہتا ہے کہ رنجیدہ رہو
ہر گھڑی ہے اک دفینہ
اس میں تم کرتے رہو
انمول ہیروں کی تلاش

ہر غبار آلودہ شام اِک نیا رئیے کی جھول ہے
وقت آئے گا کہ جب اِس جھُول سے
نکلیں گے لاکھوں ستارے جگمگاتے جاگتے
سونے کے ذرّوں کی طرح

حُسنِ استقلال سے اس وقت تک
تُو ہماری مشعلِ امیّد کی
اپنے سب ہمراہیوں کی راہ میں
نو بہ نو ہوتی رہے گی ضَو فشاں

شیخ راز

مفلس کا لہو

تُو نے آواز سنی!
ایک آشفتہ سر کی آواز
آمری جان! ذرا میرے قریب
سامنے دیکھ وہ ہے قصرِ بلند
ہے کسی صاحبِ ثروت کا محل
جس سے آتی ہے مجھے خون کی بُو
جس کی بنیاد میں مزدور کا گوشت
جس کی تعمیر میں مفلس کا لہو

دیکھ اس شمعِ شبستاں کے تلے
یاس و حرماں کی مجسّم تصویر
جیسے دنیا سے کوئی ہو بیزار
جس پہ منڈلاتی ہوئی بادِ خزاں
جس کا دنیا میں نہ ہو اپنا کوئی
جس کا گھر، دیکھ وہ فٹ پاتھ پہ ہے
جس کی میراث وہی اک گدڑی
اور فقط اک کشکول

ٹکٹکی باندھے وہ تکتا ہے محل کی جانب

دیکھ کیا دیکھ رہی ہے وہ نگاہِ حسرت
جیسے ویرانہ کوئی دیکھ لے اپنے نزدیک

دیکھ وہ سامنے اِک ماہ جبیں
گیلری کی جو بنی ہے زینت
جس کی ساری کی دمک
اور زیور کی چمک
جھلملاتی ہوئی آنکھوں میں ہزاروں کرنیں
دیکھ ہیروں کا گلوبند گلے میں اس کے
جیسے محبوب کی گردن میں کوئی
ہاتھ ڈالے ہو بڑے پیار کے ساتھ

دیکھ اُس کو کہ وہ محبوبِ نظر
شعلۂ برق سراپا بن کر
کِسی مظلوم کے خرمن کو جلانے آئی
اس نے انسان کو حیواں سمجھا
ایسی محبوب حسین
جس کا دِل برگِ گلِ تر کی طرح ہونا تھا
کیسے پتھر کا بنا
کیا امیری کا یہی شیوہ ہے ؟

تنویر عباسی

اِنتباہ

تمہارے زہر نے سقراط کو تو مار دیا
اصول اس کا ابھی تک مگر مرا تو نہیں
ستم نے دار پہ منصور کو تو کھینچ دیا
مگر وہ کہنے سے سچ بات کے ڈرا تو نہیں

خزاں کو دیکھ کے تم خوش ہوئے تو کلیوں نے
چمن سے رسم اٹھا دی ہے گل کھلانے کی
قصور ہے یہ ہماری نگاہ کا ورنہ
گلوں کی خُو ہے ہر اک رُت میں مسکرانے کی

کرو گے خور کو جو تم ریزہ ریزہ کیا ہو گا
ہر ایک ریزے میں سورج کی روشنی ہو گی
شب آئے گی تو اجالے سے پھیل جائیں گے
ستارے ساری فضاؤں میں جگمگائیں گے

اندھیرے اور اُجالے کے درمیاں لمحات
بغیر موت ستاروں کو کیسے ماریں گے
یہ جگمگاتے ستارے یہ نور کے ذرّات
جو ڈھل گئے کوئی سورج نیا ابھاریں گے

یہ زردی دیکھ کے مایوس تو نہیں ہیں ہم
ہوا سے برگِ خزاں دیدہ ٹوٹ جائیں گے
امید ہے کہ بہار آئے گی مٹیں گے غم
کھِلیں گے پھول ننھے غنچے مسکرائیں گے

تنویر عباسی

جوت جلتی رہے

جوت جلتی رہے
لَو مچلتی رہے
شور و غوغا نہ کر کر سکو دوستو! اپنے دامن میں شعلے چھپائے رہو
کل تمہارے ہی معصوم بچّے اندھیرے میں گھبرائے تو کیا کرو گے ؟
ان کی پیشانیوں کے دیے اس اندھیرے میں کجلائے تو کیا کرو گے ؟
ڈولتی کشتیوں کی طرح ذہن اُن کے بھٹکتے رہیں گے سدا
جیسے پنجرے میں پنچھی پھنسا ہو یہ حال ان کے ہو گا تن و جان کا
اس نئی نسل کے نوجوان اپنی شمعیں لئے جب تمہاری طرف آئیں گے
روشنی وہ کہاں ہو گی جس سے وہ شمعیں جلائیں — چلے جائیں گے
پھر وہ پوچھیں گے وہ روشنی کی امانت کہاں ہے جو ہوشو[1] نے دی تھی کبھی
سر جھکا دو گے تم کیا کہو گے کبھی غور تم نے کیا اس پہ بھی
اس امانت کی جاں سے حفاظت کرو
اس امانت کی جاں سے حفاظت کرو
جوت جلتی رہے
لو مچلتی رہے
شاید اس روشنی سے بھرے سندھ میں اک نئی نسل بھی آنکھ کھولے کبھی

---

[1] سندھ کے آخری تاجدار کا شیدی غلام ہوشش محمد عرف ہوشو جس نے میانی کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف بہادری سے لڑتے ہوئے جان دی۔

تنویر عباسی

ہم خود رہبر

نہ دیکھو آسماں کی طرف
نہ دیکھو آسماں کی طرف
فرشتے نہیں اتریں گے
نبی نہیں آئیں گے

یہ درد جو ہم پہ
نازل ہوا ہے ان کا
کوئی عیسیٰ ہے نہ کوئی مسیحا
ہمارے سب کے کاندھوں پہ دکھوں کی صلیبیں ہیں
ہم خود اپنے مسیحا ہیں
ہم خود اپنے پیغمبر ہیں
ہم خود رہبر ہیں
ہم خود ہی کارواں ہیں اور خود ہی سالارِ کارواں
ہم خود ہی اپنے درد کی دوا ہیں
ہم خود ہی اپنا نروان ہیں
ہم تنہا ہی ویران اندھیروں کے راہی ہیں
ہم خود ہی صبحِ کاذب کے پیغمبر ہیں
ہم خود رہبر ہیں

نیاز ہمایونی

ویت نام اے ویت نام

تیرے سورج پر ہے ظلمت کا نظام اے ویت نام
کر نہیں سکتا کوئی تجھ کو غلام اے ویت نام
تجھ کو طاقت کر نہیں سکتی تمام اے ویت نام

تیرا ہوچی محترم تو ایشیا کی آبرو
سندھ کے ہوشو کی صورت باوفا با آبرو
اُس کا نام انسان کی جہد بقا کی آبرو

آدمیت تیرا مقصد اور مقام اے ویت نام
تیرا مقصد امن اور امن دوام اے ویت نام
ہم ادب سے تجھکو کرتے ہیں سلام اے ویت نام

امداد حسینی

غزل

ہائے زہریلی خزاؤں کا سہیں کیسے عذاب
یہ مہکتے مسکراتے، سُرخ اور تازہ گلاب
ہے ابھرتا تیری ہی آنکھوں سے تازہ آفتاب
تیری ہی زلفوں سے شب کو جھانکتا ہے ماہتاب
خامشی کو گیت اور تنہائی کو جانو رباب
تشنگی کے زہر کو اے مے کشو! سمجھو شراب
ہو گئے ظلماتِ عیاشی و مکاری کی نذر
کتنے ہی معصوم چہروں کے مقدس ماہتاب
رات کے قاتل اندھیرے شہر کے رستے طویل
میں ہوں، میرا سایہ ہے اور اِک دلِ ناکامیاب
چند سکوں کے عوض بکتے رہے مانند جام
چاند سے چہروں کے مصحف خندہ زن آنکھوں کے خواب
مرمریں بانہیں، سیہ گیسو، تبسم کا نکھار
دوستو! دیکھو تو یہ امداد دیوانے کے خواب

امداد حسینی

میرا دشمن

کل اچانک مجھے اک دوست ملا
اس نے مجھ سے یہ کہا 'بات سنو'
تم نے بہت سے شعر کہے
ٹھیک ہوا
آفریں تم کو، بڑے شاعر ہو
چاند تاروں کے اجالوں پہ لکھا
تم نے محبوب کے بالوں پہ لکھا
تم نے لیکن کبھی ایسا بھی کوئی گیت لکھا
جس سے برہنہ کوئی تن ڈھانپ سکے
جس سے کوئی فاقہ زدہ پیٹ بھرے

سحر امداد[1]

کُن فیکُون

اے بد قسمت!
سوئے مسافر جاگ!
وقت آگے بڑھ رہا ہے
پیچھے گرد و غبار کے بادل ہیں
سُن!
اے رات کے مسافر!
جھانجھنوں کی تال پہ مست
ناچتی ہوئی
دور پربت سے یہ صدا آتی ہے
کوئی جوگی راگ الاپ رہا ہے
اے وقت سے بے خبر!
اے غافل!
خزاں کے پیلے پیلے پتوں کی طرح
بیتی ساعت واپس نہیں آتی
اے بد قسمت!
سوئے مسافر جاگ
وقت آگے بڑھ رہا ہے
وقت جس کی آندھی گپھاؤں میں
میرے تیرے وجود کی دھارا
راہ کے پتھروں سے ٹھوکر کھا کر
کسی نہ کسی موڑ پر ٹکرا گئی ہے

یہ ساعت عدم کا سنگم ہے
رات کے بے رحم اجالوں میں
درد کے نئے سویروں میں
زندگی کا ماحصل ہے
لمحوں کے روزن سے
روشنی کی ایک باریک کرن
میری کوکھ میں اتر گئی ہے
اور کل
یہی باریک کرن
سونے جیسے سورج کا روپ دھارے گی
وقت!
جس کی اندھی گپھاؤں میں
یہ جیتا جاگتا سورج
زندگی کا موت سے انتقام ہے
کیوں نہ آج رات بھر جل کر
ہست و بود کے وہم مٹا کر
تاریک راہوں کو روشنی دیں
رات کے گناہ و ثواب کچھ نہیں
رات تیرا میرا گھر ہے
رات جو ہمارے لئے پریت نگر ہے

---

[1] یہ نظم سندھی کی مشہور شاعرہ سحر بلوچ کی ہے جو سندھی کے صاحب طرز شاعر امداد حسین کی بیگم ہیں۔ پہلے سحر بلوچ تھیں۔ اب

امداد حسینی

قصور

ساگر مجھ سے پُوچھ رہا ہے
کہاں گئی وہ گہری نیلی آنکھوں والی؟
کیوں نہیں سیپ میں سیپ کا موتی؟
کیوں ملہار نہیں گاتی ہیں بوندیں؟
چندا مجھ سے پوچھ رہا ہے
سورج دیوتا کیوں نہیں جاگا؟
کن دیواروں کے سایے نے
بادِ صبا کو قید کیا ہے؟
کیوں نہیں کِھلتے پھول کنول کے؟
تیرا مجھ سے بات نہ کرنا اور نہ ملنا ٹھیک سہی
لیکن چاند اور ساگر نے کیا جُرم کیا ہے
ساگر تیری یاد میں پَل بھر چین نہ پائے
تیرے لئے اب جاگ جاگ کر
چندا اپنا جیا جلائے

امداد حسینی

ایک ادھوری پوری کہانی

رستے کی طرح چلتے چلتے
سگریٹ کی طرح جلتے جلتے
عمر ہے گھٹتی جائے
آخر وہ بھی وقت آئے گا
جب سگریٹ جل جائے گا
اور دھواں رہ جائے گا
اور پھر اس پر ماتم ہوگا
کچھ جھوٹے اشک بہائیں گے
اور بہت سے خوش ہوں گے
جان بچی ، دشمن سوچیں گے
لیکن میرے دل کی دشمن ؟
لیکن میرے دل کی دشمن ؟

امداد حسینی

کینسر

وقت کی دو زرد ٹھنڈی انگلیوں میں
زندگی ، جیسے کوئی سگریٹ جلے
حادثوں کی دھول ہے اس کا دھواں
راکھ ہیں سب خواہشیں
موت ہے اک ایش ٹرے

بردہ سندھی

قفس

اس میں کتنے طائرانِ خوش نوا قیدی ہوئے
کتنے نغمے کس قدر نغمہ سرا قیدی ہوئے

کتنے گیتوں کے امیں شیریں دہن قیدی ہوئے
کتنے جانِ انجمن روحِ وطن قیدی ہوئے

کتنے ہی سیمیں بدن نازک ادا قیدی ہوئے
کتنے ہی باغوں کے باسی دلربا قیدی ہوئے

جن کے گیتوں میں سحر کا دور تاروں کا نور
اوس کی سردی صبا کی مئے بہاروں کا سرور

جن کے گیتوں میں طلوعِ مہر کی عظمت کا رنگ
جن کے گیتوں میں عروسِ ماہ کے دل کی اُمنگ

گیت جن کے دن کی صورت کار فرمائی کریں
رات کی خاموشیوں کے لب سے گویائی کریں

جن کے گیتوں کو میں فصلوں کا حسیں عالم کہوں
کارخانوں صنعتوں کے حُسن کا محرم کہوں

گیت جن کے کوہساروں کی بلندی کے نشاں
گیت جن کے آبشاروں کی طرح ہر دم رواں

گیت بلبل کی طرح جن کے خموش اور دردمند
گیت جن کے چہچہوں کی طرح دلکش دل پسند

گیت جن کے بحرِ بے پایاں کی ہیبت کی مثال
گیت جن کے اہرمن کے رقص کی برقِ جلال

جن کے گیتوں میں جنونِ عشق کی شوریدگی
جن کے گیتوں میں مزاجِ حُسن کی شائستگی

گیت جن کے گھر کی الفت کی طرح رحمت سے پُر
گیت جن کے ماں کے سینے کی طرح الفت سے پُر

ہے یہاں جذبے کی آزادی نہ کچھ دل کی اُمنگ
ہر طرف ہیں اہلِ دل کے واسطے تیر و تفنگ

تاج بلوچ

روایت

(’یونسٹ پیری آکاش‘ پر پابندی سے متاثر ہو کر)[1]

پھر ہوئی دار آراستہ
بر سرِ دار پھر کوئی منصور کھینچا گیا
پھر وہی حق پرستی کے الزام ہیں
پھر ثنا خوانِ حسن و جوانی پہ تہمت لگی
پھر ہوئی دار آراستہ
بر سرِ دار پھر کوئی منصور ہے
بات کوئی نئی تو نہیں

ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے
یہ تو دستورِ کہنہ ہے روزِ ازل سے
جو ابد تک رہے گا
اب سے پہلے بھی منصور کتنے
حق پرستی کی تہمت میں مارے گئے
تختۂ دار پر یونہی وارے گئے
ہر اذیت اٹھاتے رہے

زخم کھاتے رہے مسکراتے رہے
ہاں مگر حق پرستی میں آگے بڑھے
قید جسموں کو تم لاکھ کرتے رہو

روح پر
حسن و حق کی حکومت ہمیشہ رہے گی
تم سجاتے رہو دار کو
اور یونہی ڈھونڈ کر کوئی منصور لاتے رہو
باندھ کر یونہی سولی چڑھاتے رہو

---

[1] شیخ ایاز کا پہلا مجموعۂ شعری

راز بلڑائی

غزل

اٹھیں جب بھی تری بانکی نگاہیں
ستارے بھول بیٹھے اپنی راہیں

غمِ کون و مکاں ہے دل میں رقصاں
ملیں جب سے ترے غم کی پناہیں

یہ گذرا کون دل کی رہگزر سے
جواب تک سربسجدہ ہیں نگاہیں

ہوا ہے ارزاں خونِ غنچۂ دل
سنواری جا رہی ہیں جلوہ گاہیں

دیارِ یار ہے نزدیک شاید!
مری جانب کھنچی آتی ہیں راہیں

دفورِ درد میں اکثر لبوں پر
تبسم بن کے کیوں آئی ہیں آہیں

لرز اٹھا ہے دل اے راز اپنا
نجانے کہہ گئیں کیا وہ نگاہیں

علی محمد مجروح

غزل

میں بھی تنہا ہوں اور غم کی راہیں کڑی
دور کوسوں پرے منزلِ زندگی

میرے احساس میں درد کی تازگی
میرے اشعار میں پیار کی چاشنی

تم اگر ساتھ ہو، دور منزل نہیں
کاہے کی رہبری اور کیا رہزنی

بے رخی سے سہی پر وہی اک نظر
بن گئی آخرش حاصلِ زندگی

فصلِ گل تو ہوا ہو گئی دوستو!
دل کے زخموں کو دے کر نئی تازگی

تیری اک اک ادا تیری اک اک نظر
زندگی زندگی، روشنی روشنی

حُسن تیرا غزل جیسے مجروح کی
سادگی، دلکشی، نغمگی، تازگی

نعیم درد یشانی

اندھی لہر

نخلِ ظلمت کے کھڑے ہیں ہر طرف
ہر طرف اڑتے ہیں پتے بے سبب
سانپ کے سے مَن پڑے ہیں ہر طرف
مَوت کی خنکی ہے اب اور فاصلے
ہے فضا اک لرزشِ پیہم میں گُم
چار جانب چپ کے ہیں سو سلسلے
راگ بھی پنچھی کے سرگم میں ہیں گُم
شورِ یل میں خامشی سے جا ملے
اجنبی انساں کا ہے تجھ پر گماں
ڈوری شریانوں میں ظلمت بن کے جاں
یہ سماں اور تو ہے گم سُم بے زباں
اپنے سورج کی شعاعیں ہیں سیاہ
چاندنی بھی ہے سیہ مہتاب کی
تو بھی اسٹیمر بڑھا ہاں اجنبی
بڑھ رہی ہے دیکھ وہ اک اندھی لہر
دَم میں ہم ہوں گے کہاں اے اجنبی

بشیر مورجانی

نیا سال

ہر نیا سال نئی سوچ کا ساماں لایا
نئی یادیں لایا
سال جو بیت گئے بیت گئے
میرے زخموں پہ نمک پاش ہوئے
زخم ناسور ہوئے اپنے وطن میں رہ کر
آج خوشیوں سے ہوں میں اپنے وطن میں محروم
قلزمِ فکر میں افکار کا دریا بھی گرا
وقت مشکل سے کٹا
کون سی چیز نہ بدلی ساتھی
سب سے پہلے تو حکومت بدلی
وقت شاہد ہے کہ ہر بار سیاست بدلی
ایک پھیکا سا تبسم جو ملا لوگوں کو صدیوں کے بعد
رفتہ رفتہ وہ تبسم بھی چھنا
سندھ صدیوں میں پھنسا
جیسے ظلمت میں ستارہ چمکے
اور پھر گھور اندھیرے میں چھپے
سوچتا ہوں یہ تبسم یہ ہنسی بھی کیا ہے
پھر وہی کرب ہے اور وہ ہی سستی
ہر نیا سال نئی سوچ کا ساماں لایا

شیخ محمد ابراهیم خلیل

آزادی

ہے پوشیدہ وطن کی خاک میں تعمیر آزادی
نظر آتی ہے ہر ہر ذرّے میں تصویر آزادی

تجھے احساس جب اے نوجواں ہوگا غلامی کا
سکھا دے گی تجھے تقدیر خود تدبیر آزادی

اسے نقاشِ فطرت نے بنایا دل کے پردے پہ
مٹائے سے نہیں مٹنے کی یہ تصویر آزادی

نہ آیا راس اپنے دل کو یہ زندان آب و گِل
کہاں ظلمت اسیری کی کہاں تنویر آزادی

قدم آگے بڑھے گا چاہے منزل دور ہو کتنی
جنوں سمجھو اسے یا ہمت رہگیر آزادی

وطن کے نام پر مرنا بھی یکسر زندگانی ہے
حقیقت میں یہی ہے مقصدِ تعمیر آزادی

اسیری کا خلیلؔ اپنی فسانہ ہے فقط اتنا
بگاڑی اپنی فطرت ہی نے خود تقدیر آزادی

روشن مغل

او ساتھی!

اس دنیا کی ویرانی میں ملے گی منزل یا کہ نہیں؟
بھٹک بھٹک کر ادھر ادھر
پاؤں مرے تھک جائیں اگر
پھر بھی رہیں گے کھوج میں تیری
جگہہ کوئی ہم کو بھی ملے گی جینے کے قابل یا کہ نہیں؟
او ساتھی!
چار گھڑی کو اس دنیا کی بستی میں ہم آئے ہیں
حیراں حیراں دیکھا بھالا
غیر سمجھ کے بولے چالے
لیکن منزل ایک ہی تھی
مشکل کا حل ایک ہی تھا
ہاتھ ہاتھ دیا تھا لیکن راہ نئی اپنالی
کچھ بھی فکر ہوئی؟ او ساتھی!
زریں چادر بادل کی چیر کے روشن سورج
اپنی منزل پر آیا ہے
جبل جبل پر چھایا ہے
بس اب رات بھی چھائے گی
اپنے پر پھیلائے گی
دل والوں کو ویرانے میں کون سہارا دے گا؟
کیسے رات کٹے گی؟
او ساتھی! او ساتھی!

سلیم گاڈھوی

ترغیب

ہر قدم کو وقار دیتا چل
آسماں کو غبار دیتا چل

وقت تجھ سے یہی تو کہتا ہے
قافلے کو پکار دیتا چل

زندگی کا نشاں تحرک ہے
جہد پیہم کا پیار دیتا چل

منزلیں خود ہی بڑھ کے آئیں گی
عزم کا اعتبار دیتا چل

موت مُردوں سے مات کھاتی ہے
زندگی کو نکھار دیتا چل

بیٹھنا خواب، چلنا بیداری
جاگنے کا شعار دیتا چل

دل کو توفیقِ حق پرستی دے
سر کو سچ کا خمار دیتا چل

اپنے خونِ جگر سے بھی اے دوست!
اس چمن کو بہار دیتا چل

جنگلوں کا سفر، اندھیری رات
شعلہ بن کر شرار دیتا چل

پرچمِ حق جو اونچا رکھنا ہے
اپنی دھرتی کو پیار دیتا چل

اپنے ذوقِ سلیم کو پیارے
روحِ نغمہ نگار دیتا چل

(نثری ڈرامہ)

مُرادعلی مرزا

چوُراہا

کردار:- ۱- سردار - ۲- شاعر - ۳- خاتون - ۴- سرائے کا مالک - ۵- نواب
۶- کیپٹن - ۷- بادشاہ - ۸- سالار - ۹- پہرے دار - ۱۰- سپاہی

پُر اسرار موسیقی جس سے رات کا تاثر ظاہر ہوتا ہے۔ پس منظر میں چار گھوڑوں والی گاڑی دور سے بڑی تیزی کے ساتھ آتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ گھوڑے ہنکارتے ہیں۔

سردار: (بلند آواز میں) اے شخص! تو کون ہے؟

شاعر: (حیرت سے) میں ... میں!! میں ایک انسان ہوں۔

سردار: (بھاری آواز میں) انسان! .... جلدی کر .... آ اس گاڑی میں بیٹھ جا۔

شاعر: (قدرے بے اعتنائی سے) گاڑی میں؟

سردار: ہاں۔ ہاں۔ گاڑی میں۔ وقت ضائع نہ کر۔ جلدی آ۔

(گھوڑے ہنکارتے ہیں)

سردار: (بلند آواز میں) گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لی جائیں۔

(گھوڑے تیزی سے بھاگتے ہیں۔ گاڑی کی آواز موسیقی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور موسیقی گاڑی کی آواز میں فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے۔ گاڑی چلتے چلتے ایک جگہ رک جاتی ہے۔ کوچوان گاڑی سے اتر کر کسی سرائے کے بند دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹاتا ہے)

سرائے کا مالک: (مالک کی ڈیڈ ساؤنڈ سے) کون ہے؟ جو آدھی رات کو آ کر شریف آدمیوں کی نیند اڑا رہا ہے۔ میری سرائے تو کب کی بند ہو چکی ہے۔ جاؤ کسی دوسری سرائے کا دروازہ پیٹو۔ (دروازہ کھٹکنے کی آواز ابھرتی ہے ساتھ ہی سرائے کے مالک کی بڑبڑاہٹ بھی) ارے میں کہتا ہوں کھڑ کھڑ نہ کرو۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ (زیر لب) خدا جانے کیسے کیسے بیکار آدمی اس سرائے میں آ جاتے ہیں۔

سردار: (مرعوب کُن لہجے میں) جلدی سے دروازہ کھولو کیا تم مجھے نہیں جانتے ہو؟

سرائے کا مالک: ارے آپ ہیں سردار صاحب! سائیں! گستاخی معاف مجھے کیا خبر تھی کہ اتنی رات گئے آپ آئیں گے۔ میں ابھی دروازہ کھولتا ہوں۔ یہ تو آپ کی اپنی سرائے ہے۔

(دروازہ کھلنے کی آواز)

سرائے کا مالک: آئیے سردار صاحب! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

سردار: (شاعر سے مخاطب ہو کر) اے میاں انسان! چلو نیچے اترو۔ ذرا اس خاتون کو بھی سہارا دے کر اتارو اور دونوں میرے ساتھ آؤ۔

(قدموں کی چاپ۔ پھر کمرے میں پڑی ہوئی کرسیوں کے دھر ادھر سرکانے کی سرسراہٹ)

سرائے کا مالک: (عاجزی سے) سردار صاحب! ہمیں آپ کے آنے کی خبر پہلے مل جاتی تو آپ کے لئے ہر شے تیار ملتی۔ اس وقت تو کھانے کا انتظام بھی ممکن نظر نہیں آتا۔ سبھی نوکر جا کر.....

سردار: (بات کاٹتے ہوئے) موم بتیاں تو منگا لو۔

سرائے کا مالک: موم بتیاں تو سرکار! ہمارے پاس ہیں میں ابھی جلاتا ہوں۔ پہلے معلوم ہوتا تو آپ اس کمرے میں کئی جھاڑ فانوس دیکھتے۔

سردار: یہ موم بتیاں تو کم ہیں۔ ایک درجن موم بتیاں اور لے آؤ۔

سرائے کا مالک: بہت اچھا سرکار! میں ابھی لاتا ہوں۔

سردار: (شاعر سے مخاطب ہو کر) ہاں تو اب بتاؤ تم کون ہو؟

شاعر: جناب! میں شاعر ہوں۔

سردار: (طنزیہ ہنسی ہنستا ہے) شاعر؟ (کرخت لہجے میں) تم کہاں رہتے ہو اور کیا کرتے ہو؟

شاعر: جس چوراہے پر میں آپ کی گاڑی میں سوار ہوا اس کے دائیں طرف ایک بستی ہے۔

سردار: ہاں مجھ کو خبر ہے آگے چلو۔

شاعر: میں اس چھوٹی سی بستی میں رہتا ہوں میرا باپ محنت مزدوری کرتا ہے اور میں.....

سردار: ہاں اور تم شاعری کرتے ہو (زور دیتے ہوئے) ایسا ہی ہے نا؟

شاعر: ہاں جناب! شاعری تو میری زندگی ہے اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

سردار: اور اس وقت چاندنی رات میں اپنے گھر سے دور اس چوراہے پر مزے سے شاعری کر رہے تھے۔

(کھل کھلا کر ہنستا ہے)

شاعر : نہیں جناب! میں کہیں اور جانا چاہتا ہوں

سردار : کہیں اور سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ کیا تم اپنی بستی ۔

شاعر : ہاں ہاں میں اپنی بستی سے دور رہنا چاہتا ہوں اس نفرت کے نگر میں کوئی بھی میرا نہیں میں نے سوچا ہے کہ کسی ان دیکھی دنیا میں چلا جاؤں گا جہاں کے لوگ مجھے عزت دیں گے اور میرے فن کی قدر ہو گی ۔

سردار : پھر تو سچ مچ تم ایک خوش قسمت انسان ہو۔

(کسی کے قدموں کی آہٹ ابھرتی ہے)

سرائے کا مالک : سائیں! موم بتیاں مل گئیں۔ یہ دیکھئے پوری ایک درجن ہیں۔

سردار : مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں۔ ان سب کو روشن کر دو۔

سرائے کا مالک : س۔ سا۔ ساری موم بتیاں ؟ حاضر سائیں! بس ابھی کرتا ہوں۔

سردار : (شاعر سے مخاطب ہو کر) تم واقعی خوش قسمت ہو۔ آج رات تمہاری سوئی ہوئی تقدیر جاگ اٹھے گی اس لڑکی کو غور سے دیکھو۔ یہ میرے مرحوم بھائی کی اکلوتی نشانی ہے۔ مال و دولت کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں۔ رہا حسن اور اخلاق سو تم نے خود ہی دیکھ لیا۔ اگر اس کا حسن و جمال تمہاری شاعرانہ امنگوں کو ابھارتا ہے تو بس تمہیں فقط ایک لفظ کہنا ہو گا۔ میں اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا۔

شاعر : یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو ایک غریب شاعر ہوں۔ میں تو ایسی خوب صورت لڑکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مہربانی کر کے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنی راہ لوں۔

سردار : (سختی سے) نہیں۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ سُن لو کہ آج اس کی شادی میرے ایک پیارے دوست سے ہونی تھی۔ وہ بھی میری حیثیت کا سردار تھا۔ میں نے اسے زبان دی تھی مگر عین موقعہ پر معزز مہمانوں کے سامنے اس لڑکی نے جو اس وقت بڑی فرمانبردار بنی چپ چاپ بیٹھی ہے۔ مجھ کو ذلیل و خوار کیا۔ اس نے شادی سے انکار کر دیا اور بھری محفل میں میری سخت بے عزتی ہوئی۔ اس وقت تو میں کچھ بھی نہ کر سکا مگر میں نے قسم کھائی کہ اس کو ساتھ لے کر کسی طرف روانہ ہو جاؤں گا اور راستے میں جو کوئی پہلا آدمی ملے گا اس سے اس کی شادی کر دوں گا چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اب

اس کی شادی تم سے ہوگی۔ میں صرف دس منٹ کی مہلت دیتا ہوں جن میں تم کو فیصلہ کرنا ہے اب کسی حیل وحجت کی ضرورت نہیں۔

شاعر: لیکن یہ ناممکن ہے۔ جناب! میں اس معزز خاتون سے شادی کے لائق نہیں ہوں

سردار: چپ رہو۔ میں اپنے فیصلے کو بدل نہیں سکتا۔

شاعر: تو پھر مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس خاتون سے کچھ باتیں کرلوں۔

سردار: اجازت ہے مگر مجھے دس منٹ کے اندر جواب چاہیئے۔

(وقفہ)

شاعر: (خاتون کے قریب جاکر) معزز خاتون! تم نے سُنا کہ میں ایک مفلس شاعر ہوں میں تم جیسی خوبصورت اور خوش خصلت دوشیزہ کا مستحق ہرگز نہیں لیکن تم نے سردار کی گفتگو بھی سُنی ہوگی۔ اگر یہ سب کچھ میرے شاعرانہ جذبے کا امتحان ہے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ اپنے فرض کی ادائیگی میں مجھ سے کوئی کوتاہی نہ ہوگی۔

خاتون: (نرم اور میٹھی آواز میں) شاعر! تم ایک نیک اور رحمدل انسان نظر آتے ہو۔ یہ سردار میرا چچا اور تنہا سرپرست ہے۔ اس نے مال و دولت کے لالچ میں میرے ماں باپ کو قتل کرادیا۔ اس کو مجھ سے سخت نفرت ہے اس لئے کہ میں اپنی ماں کی طرح ہوں۔ والدین کے خاتمے کے بعد اس نے مجھ پر بڑی سختیاں کیں۔ اس نے میری زندگی کو زہر بنادیا۔ میں اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتی رہی مگر آج اس نے میری شادی ایک ایسے شخص سے کرنا چاہی جس کی عمر مجھ سے تین گنی ہوگی۔ (ٹھنڈی سانس بھر کے) میں تمھاری ہمدردیوں کی شکر گذار ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ تم اس ظالم کی ضد پوری کرنے میں اس کی مدد نہ کروگے۔

شاعر: محترمہ! تم اطمینان رکھو۔ میرا مقصد اس ظالم کی مدد کرنا ہرگز نہیں۔ مجھے تو تم پر رحم آتا ہے ہیں تم سے پیار اور محبت کی بھیک نہیں مانگتا بس یہ چاہتا ہوں کہ تم اس ظالم کے چنگل سے آزاد ہو جاؤ۔ ممکن ہے کہ ہمارے درمیان پیار کا پاکیزہ رشتہ پیدا ہوسکے۔ تم کو دیکھ کر یقین تو ہے کہ میرا مستقبل روشن ہوگا۔ کیا تم مجھ پر بھروسا کرسکتی ہو؟

خاتون: (کچھ بیقرار ہوکر) میرے لئے تم اپنے آپ کو قربان کیوں کررہے ہو۔

شاعر: تمہارے لئے تو جان بھی قربان کرنا پڑے تو میں پروا نہ کروں گا۔

خاتون: تم کو پچھتانا پڑے گا۔ تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے۔

شاعر: ایسا نہ کہو پیاری ایسا نہ کہو۔ میں ساری عمر تم کو خوش رکھنے کی کوشش کروں گا اور یہ ثابت کروں گا کہ میں واقعی تمہارے لائق ہوں۔

خاتون: (کچھ سوچ کر ٹھنڈی سانس بھرتی ہے) میں تم پر بھروسا کرتی ہوں۔ جاؤ اور اس سے کہدو۔

(وقفہ)

سردار: (حقارت سے) لو لو اب کیا کہتے ہو؟ تم نے کیا فیصلہ کیا؟ ابھی دو منٹ باقی ہیں۔

شاعر: مجھے رشتہ منظور ہے۔

سردار: بس ٹھیک ہے۔ ذرا سرائے کے مالک کو تو بلاؤ۔

(سرائے کا مالک قریب ہی سے بولتا ہے)

سرائے کا مالک: حاضر ہوں سرکار! فرمایئے کیا حکم ہے۔

سردار: جاؤ اور گلاب کا اچھا سا شربت بنا کر فوراً لے آؤ۔

سرائے کا مالک: بہت اچھا حضور! ابھی لاتا ہوں۔

(وقفہ)

سردار: (شاعر سے مخاطب ہو کر) میں اس لڑکی کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ اب یہ تمہاری بیوی ہوگی۔

شاعر: جناب! میں آپ کے اس احسان کا بدلہ کبھی بھی نہ دے سکوں گا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے جو....

سردار: جو تم کو اتنی خوب صورت اور دولت مند شریک حیات ملی ہے (ہنستا ہے)

سرائے کا مالک: سرکار! یہ لیجیے گلاب کا شربت حاضر ہے۔

سردار: شاباش۔ یہ تیری خدمت کا صلہ تجھ کو اچھا دیا جائے گا۔ لو میاں شاعر! اپنی شادی کی خوشی میں ابھی تو یہ شربت پیو۔ کل دھوم دھام سے رخصتی کی رسم ادا کی جائے گی۔ مگر یاد رکھنا تم نے یہ فیصلہ کر کے بڑی غلطی کی ہے۔

شاعر: جناب! یہ سب کچھ تو آپ کے حکم سے ہوا ہے۔

سردار: ہاں ٹھیک ہے لیکن تم نے ایک ایسی لڑکی کو قبول کیا ہے جو تمہاری زندگی تباہ و برباد کر دے گی۔

اس کی رگوں میں خون کی بجائے نفرت و حقارت بھری ہوئی ہے۔ اس کے دل میں شیطان کا ڈیرہ ہے یہ تم کو ساری دنیا میں خراب و خوار کرے گی۔

شاعر: (بےچین ہو کر) بس .... بس۔ اب میں ایک لفظ بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہوں (غصے میں) تم نے خود ہی اسے میرے حوالے کیا ہے۔ اب وہ میری ہے اور تمہیں اس کے بارے میں یہ باتیں کہنے کا کوئی حق نہیں۔

سردار: (طنز سے) اوہو! ابھی سے اتنی ہمدردی شروع ہو گئی مگر تم کو دو دن میں ہی پتا چل جائے گا کہ یہ ڈائن ہے ڈائن۔

شاعر: (شربت کا گلاس اچھال کر سردار کے منہ پر مارتا ہے) خبردار اگر کچھ اور کہا تو زبان کھینچ لوں گا۔

سردار: (سخت غصے میں) بے ادب! گستاخ!! تیری اتنی ہمت جو میری بے عزتی کرے۔ میں تجھے اس گستاخی کا مزا چکھاؤں گا (پستول نکال کر) اس پستول کی ایک ہی گولی تجھے جہنم رسید کر دے گی۔

شاعر: میں اس سے ڈرنے والا نہیں لیکن سوچ لے کہ کسی نہتے پر اس طرح حملہ کرنا بزدلی ہے۔

سردار: (نفرت کی ہنسی ہنستا ہے) بزدلی؟ اچھا تو یہ لے اس پستول کو سنبھال میرے پاس دوسرا پستول بھی ہے۔

سرائے کا مالک۔ (کرب سے) خدا کے واسطے یہاں یہ خون خرابا نہ کرو۔ رحم کیجئے سردار! اس پر رحم کیجئے۔

سردار۔ (غصے میں) بند کر یہ بکواس (شاعر سے) دیکھتا کیا ہے ہمت ہے تو گولی چلا۔ گیدڑ کہیں کا۔

خاتون: ہاں۔ ہاں۔ ڈرتے کیوں ہو۔ برابر کا مقابلہ ہے۔

سردار: ٹھہر جا ابھی فیصلہ ہو جائے گا۔ میں نے تیرے لئے بڑھئی تلاش کیا اور تجھے بیوہ بھی کروں گا۔

شاعر: تجھ کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ تیری خوش فہمی ہے۔

خاتون۔ تم نے جذباتی ہو کر غلط قدم اٹھایا ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے بس میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔

شاعر: مجھے یقین ہے کہ فتح ہماری ہو گی۔

سردار: وقت برباد نہ کر۔ میز کے اس سرے پر بیٹھ جا اور اپنی اس سگی کی طرف سے فائرنگ کے اعلان کا انتظار کر۔

خاتون: (دور ہٹ کر بھاری آواز میں) فائر .....

(پستول کی دو گولیاں ایک ہی وقت میں چلتی ہیں۔ شاعر آہ کر کے زمین پر گر پڑتا ہے)

خاتون: (روتے ہوئے) ہائے! گولی تو ان کے ہی لگی ظالم! یہ تو نے کیا کیا۔ مار دیا نا اس غریب کو۔

سرائے کا مالک: (تعجب سے) مرگیا؟ اب کیا ہوگا؟ پولس تو آکر مجھے گرفتار کرے گی۔

سردار: (ڈانٹتے ہوئے) چپ رہو۔ بس اب معاملہ ختم ہو گیا۔

(لڑکی سے مخاطب ہوکر) تو اب یہاں کیوں بیٹھی ہے اٹھ جلدی کر ہمیں آگے جانا ہے۔

خاتون:۔ (زار و قطار روتے ہوئے) اس ظالم کی گولی تو تمہارے دل پر لگی ہے۔

شاعر: (تڑپتے ہوئے) ہاں میرا دل ڈوب رہا ہے لاؤ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدو۔ بس اب الوداع۔ خدا حافظ۔

(شاعر آخری ہچکی لیتا ہے۔ خاتون سسکیاں بھر کر روتی ہے غمگین موسیقی کی لے پس منظر میں آہستہ آہستہ ابھرتی ہے)

(وقفہ)

شاعر: (بڑبڑاتے ہوئے) ارے یہ کیا ہو گیا۔ میں کہاں ہوں؟ خاتون! خاتون!! نہیں نہیں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ میں تو اسی چوراہے پر بیٹھا ہوں۔ یہ خواب ہے یا حقیقت؟ یہ راستہ تو ادھر ہی جاتا ہے۔ ایسر گاڑی کے نشان بھی وہی ہیں (خوفناک انداز میں) نہیں نہیں میں اس طرف نہیں جاؤں گا۔ یہ راہ خطروں سے بھرپور نظر آتی ہے۔ مجھ کو اب دوسری طرف جانا چاہیے شاید اپنی منزل کو پاسکوں۔

(آخری الفاظ پر اسرار موسیقی میں گم ہو جاتے ہیں۔ دفعتاً کسی کے زمین پر گرنے کی آواز جیسے کوئی زینے اترتے ہوئے گرا ہو)

خاتون: کیوں جی! اتنی جلدی (ہنستے ہوئے) تمھیں چوٹ تو نہیں لگی۔

شاعر: (بدحواس ہوکر) نہ۔ نہ۔ اوہ!...... معاف کرنا میں ذرا جلدی میں تھا۔ زینے سے نیچے اترتے وقت شاید پیر پھسل گیا۔ خیر پروا نہیں ہے۔

خاتون: (ہنستے ہوئے) تم پریشان نہ ہو آئندہ زینے سے اترتے ہوئے خیال رکھنا۔ (وقفہ) مگر تم میرا منہ کیا تک رہے ہو۔

شاعر: (سوچتے ہوئے) کچھ بھی تو نہیں۔ شاید..... شاید میں نے تمھیں کہیں دیکھا ہے۔

خاتون: (زیادہ ہنستے ہوئے) تم نے مجھے دیکھا ہے؟ معاف کرنا۔ شاید تم بھول رہے ہو۔

شاعر: میں بھول رہا ہوں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تم سے.....

خاتون: (بات کاٹ کر) خیر۔ خیر۔ اس دنیا میں کتنے ہی آدمی ایسے ملیں گے جن کے چہرے بشرے بہت ملتے جلتے ہوں۔ تمہارا سب سازو سامان بکھر گیا ہے کیا میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں؟

شاعر: شکریہ۔ تم تکلیف نہ کرو میں آپ ہی سمیٹ لوں گا۔

خاتون: (سوالی انداز میں) شاید تم اسی جگہ رہتے ہو۔

شاعر: جی ہاں۔ میں یہیں رہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میں بھی یہاں کا ایک کرایہ دار ہوں۔

خاتون: یہ جگہ تو کافی بڑی اور کشادہ ہے۔ تم اس کے کس حصے میں رہتے ہو۔

شاعر: میں اوپری حصے میں رہتا ہوں۔

خاتون: معاف کرنا۔ ویسے مجھے ایسی باتیں پوچھنے کا کوئی حق تو نہیں پر.....

شاعر: نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔ در اصل میں اس جگہ کے بالائی حصے میں کمرہ نمبر.....

خاتون: خیر مجھے یہ نہ بتاؤ۔ ہاں مجھ کو اپنی غلطی کا احساس ہے مگر سچ پوچھو تو اس جگہ اور اس جگہ سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے مجھے فطری دلچسپی ہے کبھی یہ جگہ میری ملکیت تھی۔ میں اکثر یہاں آتی ہوں اور اس زمانے کے خواب دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ (ٹھنڈی سانس بھرتی ہے)

شاعر: (ہمدردانہ لہجے میں) مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے۔ میں اوپری منزل کے اس کمرے میں رہتا ہوں جہاں یہ زینہ ختم ہوتا ہے۔

خاتون: تمہارا مطلب ہے جہاں یہ زینہ ختم ہوتا ہے اس کے سامنے والے کمرے میں؟

شاعر: جی ہاں۔ اسی کمرے میں۔

خاتون: (ٹھنڈی سانس لے کر) تو پھر مہربان! تمہیں زیادہ ترسانا مناسب نہیں۔ یقیناً تم اس کمرے کی خاطر خواہ دیکھ بھال کرتے ہو گے۔ افسوس میرے پاس تو اس کمرے کی کچھ یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ (مسکراتے ہوئے) اچھا۔ خدا حافظ۔

شاعر: (زیرِ لب) خدا حافظ۔
(شاعر آہستہ آہستہ زینہ چڑھتا ہے پیروں کی آہٹ موسیقی میں تحلیل ہو جاتی ہے)

——(رات کا منظر)——

کیپٹن: (میز پر مکہ مارتے ہوئے) آج رات ...... ہاں آج کی رات اس کا معاملہ تمام کرنا ہے۔
میں اب ان کی ناکام سازش سے بیزار ہو گیا ہوں۔ یہ اشارے، سرگوشیاں، ملاقاتیں اور صلاح مشورے سب فضول ہیں۔ ہمیں اس سازش میں ایمانداری سے کام کرنا چاہئیے۔ ہم سب کی سلامتی اسی میں ہے کہ ہم اسے قتل کر ڈالیں ...... آج کی رات ..... میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج رات میرے ہاتھ اس کا گلا گھونٹ دیں گے اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔

نواب: (اطمینان سے) مہربان دوست! اس وقت مجھ کو تم سے اتفاق کرنا ہو گا۔ ایسا انتظار سے کچھ حاصل نہیں۔ محلات کے پہریداروں میں کئی اپنے آدمی ہیں جو اپنی بڑی مدد کریں گے۔

کیپٹن: (اسی جذبے سے) بس بس جو کچھ میں نے کہا وہی ہو گا۔ میں آج رات اُسے ختم کر دوں گا۔

نواب: لیکن ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ محلات کے پہریداروں تک پیغام رسانی کیسے ہو؟
شاہی گارڈ کے پہریداروں میں ہمارے آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ فی الوقت کون ایسا آدمی ہے جو وہاں تک پہنچ سکے؟ میجر تو محلات کی سیڑھیوں والی چوکی پہ موجود ہو گا۔ ایک مرتبہ اگر اس تک ہمارا پیغام پہنچ جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

خاتون: اس کام کا ذمہ میں لیتی ہوں۔

نواب: (حیرت سے) شہزادی! تم؟ (وقفہ)

خاتون: (اطمینان سے) سنو کہ اُس جگہ کے بالائی حصے کے ایک کمرے میں کوئی نوجوان رہتا ہے۔

کیپٹن: (جلدی سے) نوجوان؟ کون ہے وہ نوجوان؟

خاتون: پہلے مجھے اپنی بات پوری کرنے دو۔ ہاں تو وہ نوجوان ایک دیہاتی ہے۔ اس سے میری اتفاقیہ ملاقات ہوئی۔ وہ ایک معصوم اور بھولا بھالا آدمی نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مَن کی دنیا کے سوا

اُسے کسی دوسری بات سے کوئی واسطہ نہیں۔

کیپٹن: ایسے آدمی پہ بھروسا کرنا نادانی ہے۔

نواب: کیپٹن؟ تم ہمیشہ جلد بازی کرتے ہو۔ کچھ اطمینان سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ بے صبری ٹھیک نہیں

خاتون: میرا بھی خیال یہی ہے۔ کم سے کم میں تو اس پہ پورا پورا بھروسا کرسکتی ہوں۔ (مسکراتے ہوئے)

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ہے۔ مجھے ان میں پیار اور محبت کی چمک نظر آئی ہے۔

کیپٹن: اوہو۔ تو یہ ماجرا ہے تب تو زیادہ خبرداری کرنی ہوگی۔

نواب: ہاں ایسی صورت میں خبرداری لازمی ہے۔ ایسے آدمیوں پہ جاسوس ہونے کا شک کیا جاسکتا ہے۔

خاتون: میں یقین سے کہتی ہوں کہ وہ ان الزاموں سے پاک ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے

پر پہنچی ہوں کہ اِس کام کے لئے اس شخص سے زیادہ کوئی دوسرا موزوں آدمی نہ مل سکے گا مجھے

صرف دو تین لفظ کہنا پڑیں گے (پختگی اور وقار سے) وہ مجھ پہ دل و جان سے فدا ہے۔

کیپٹن: تو پھر دیر کس لئے؟

نواب: (سنجیدگی سے) شہزادی انّم نے اس تحریک کی بڑی خدمت کی ہے۔ میں آج اقرار کرتا

ہوں کہ تمھارے پاس حُسن کے ساتھ ساتھ عقل بھی ہے (کچھ زوردار لہجے میں) اب وقت

ضائع نہ کرو۔ لو اِس لفافے میں میجر رتے کے لئے پیغام بند ہے یہ تمھارے حوالے کرتا ہوں

باقی کام تمھارا۔ ہمیں اب آگے کی باتیں سوچنا ہیں۔

(موسیقی)

(زینے پر کسی کے تیز تیز چڑھنے کی آواز اور پھر دروازہ کھٹکھٹانے اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز)

خاتون۔ (رسان سے) معاف کرنا۔ میں نے تمھارے آرام میں خلل ڈالا۔ یہ .....

شاعر:۔ (حیرت سے) ارے تم! اور اس وقت؟

خاتون: میں اس وقت سخت مجبور ہوں۔ اب سوائے تمھارے دوسرا کوئی بھی ایسا نہیں جس سے مدد لے سکوں۔

شاعر: مجھے فوراً بتاؤ۔ تمھاری ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔

خاتون: مجھے تم سے یہی امید تھی۔ میں سخت پریشانی میں ہوں۔ میری پیاری ماں اس وقت بسترِ مرگ

پر ہے گھر میں میرے سوا کوئی بھی دوسرا نہیں جو اس کی خبرگیری کرے۔ میرے چچا شاہی محل میں

پہریداروں کے سردار ہیں۔ تم مہربانی کر کے اُن کو بلا لاؤ۔ اُمّید ہے . . . . .

شاعر: (بات کاٹ کر) تمھارے حکم کی تعمیل کر کے مجھے روحانی مسرت ہوگی۔ مگر میں یہاں ایک اجنبی ہوں مجھے خبر نہیں کہ شاہی محل میں کس طرح پہنچا جائے۔

خاتون: اس کی تم کوئی فکر نہ کرو۔ میں ان کے لئے یہ خط لکھ لائی ہوں۔ تم شاہی محل کے سیڑھیوں والے دروازے سے جانا۔ دروازے پر جو پہریدار ملیں ان سے صرف اتنا کہنا "عقاب اپنے نشیمن سے اڑ گیا"۔ پھر وہ تمھیں اندر جانے کی اجازت دے دیں گے۔ یاد رکھنا بس یہی کہنا ہے۔

شاعر: "شاہی محلات کی سیڑھیوں والا دروازہ اور "عقاب اپنے نشیمن سے اڑ گیا"۔ بس یہی نا۔

خاتون: بالکل درست۔ اس دروازے داخل ہو کر محل میں جانے والے راستے پر جانا وہاں جو پہریدار ملیں ان سے بھی یہی کہنا۔ ان میں سے جو یہ الفاظ کہے "اڑ جانے دو" اس کے ہاتھ میں یہ خط دینا۔ تمھیں خبر ہے کہ ملک میں بغاوت کا دور دورہ ہے اس لئے رات کے وقت محلات میں جانے کے لئے یہ خاص اشارے مقرر ہیں۔ مجھے بھی یہ سب کچھ چچا نے بتایا۔ (گڑگڑاتے ہوئے) میں اُمید رکھتی ہوں کہ تم یہ خط فوراً انہیں پہنچا دو گے تاکہ ماں جیتے جی انھیں اپنی آنکھیں پتھرانے سے پہلے دیکھ سکے

شاعر: تم دل چھوٹا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ابھی تمھارے چچا کو لے آتا ہوں اور ہاں تم اجازت دو تو پہلے تمھیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔ اتنی رات ہو گئی ہے اور تم اکیلی ہو۔

خاتون: (پریشان ہو کر) نہیں نہیں تم فوراً محل کی طرف جاؤ۔ وقت بہت کم ہے (آہستگی سے) میں کسی وقت تمھیں اس احسان کا بدلہ ضرور دوں گی۔

شاعر: خیر جو تمہاری مرضی۔ اچھا میں جا رہا ہوں۔

(شاعر تیزی سے زینے کی سیڑھیاں اتر رہا ہے پس منظر میں پر اسرار موسیقی ابھرتی ہے۔ ہوا کا ہلکا ہلکا تاثر بھی ابھرتا ہے)

(وقفہ)

پہریدار: (چونکتے ہوئے) کون ہے؟

شاعر: (اطمینان سے) "عقاب اپنے نشیمن سے اڑ گیا"

سپاہی: اندر جانے کی اجازت ہے۔

(موسیقی جس سے اندازہ ہو کہ شاعر تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے)

سپاہی: (دور سے) کون ہے؟

شاعر: (رسان سے) "عقاب اپنے نشیمن سے اڑ گیا"

میجر رے: "اڑ جانے دو"

شاعر: تو آپ ہی میجر رے ہیں۔ اس لفافے میں آپ کے لئے پیغام ہے۔

سالار: (آگے بڑھ کر) دیکھیں کس کا پیغام ہے؟ میجر! یہ شخص کون ہے؟

میجر: (پریشان ہو کر) یہ شخص؟ یہ شخص؟ میں سمجھتا ہوں.....

سالار: (اطمینان سے) خیر۔ یہ خط مجھ کو دو اور تم دونوں میرے ساتھ بڑے کمرے میں آؤ۔ سپاہیو!
ہوشیار ہو جاؤ۔

(قدموں کی آہٹ اور پھر وقفہ)

سالار: ٹھیک ہے (خط کھول کر) یہ پیغام پہلے مجھے پڑھنا چاہیے (وقفہ)..... ہوں!..... سپاہی!

سپاہی: جی سرکار؟

سالار: محل کے دروازے کے پہریداروں کو فوراً گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا جائے اور وہاں خاص آدمیوں
کو رکھا جائے۔ میجر رے کی بھی پوری نگرانی کی جائے..... اجنبی! تو میرے ساتھ چل۔

—— موسیقی ——

سالار: (ادب سے) عالی جاہ! میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اس محل میں بھی سازشیوں اور باغیوں کے
اڈے موجود ہیں۔ مگر عالم پناہ نے اس حقیقت کو محض میرا واہمہ تصور کر کے نظر انداز کر دیا۔ یہی
سبب ہے کہ یہ شخص بے خوف و خطر بڑے اطمینان سے محل میں داخل ہو گیا۔ اس کے پاس باغیوں
کا ایک پیغام تھا جو اب میرے قبضے میں ہے۔

بادشاہ: بادولت اس سے خود پوچھنا چاہتے ہیں۔

شاعر: ظل سبحانی کا اقبال بلند ہو۔

بادشاہ: اجنبی! تو کہاں سے آیا ہے؟

شاعر: جہاں پناہ! اس شہر سے شمال کی جانب کافی دور ایک پہاڑ ہے اس کے اوپر کی طرف ایک

چھوٹی سی بستی ہے۔ میں وہیں کا رہنے والا ہوں۔

بادشاہ: وہاں تو کیا کرتا ہے؟

شاعر: عالی جاہ! میرا باپ محنت مزدوری کرتا ہے اور مجھے شاعری سے دلچسپی ہے۔

بادشاہ: اچھا تو پھر تو ایک شاعر ہے۔

سالار: عالم پناہ! گستاخی معاف۔ مجھے بھی اس سے کچھ پوچھنا ہے۔ اجازت ہو تو.....

بادشاہ: ہاں ہاں ضرور پوچھو۔

سالار: جہاں پناہ! پہلے میں یہ خط پڑھتا ہوں جو اس سے میں نے حاصل کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

"آج شہزادے کے مرن کی رات ہے۔ جب بادشاہ حسب معمول آدھی رات کو عبادت گاہ کی طرف جائے گا تو راستے میں ہی اسے ختم کر دیا جائے گا اس لئے عبادتگاہ کی طرف روانگی کے وقت محل کے زینے کی اوپر طرف والے کمرے میں تیز روشنی کی جائے۔"

(شاعر سے مخاطب ہو کر) تو نے یہ سب کچھ سنا۔ اب یہ بتا تجھے خط کس نے دیا؟

شاعر: جناب! میں آپ کو سچی سچی بات بتاتا ہوں۔ یہ خط مجھے ایک خاتون نے دیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی ماں بستر مرگ پر ہے اس لئے اس کے چچا کا قریب ہونا ضروری ہے۔ اس خط سے میرا کوئی اور واسطہ نہیں مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ ایک حسین اور نیک خاتون ہے۔

سالار: وہ کس قسم کی خاتون ہے کیا تو اس کے بارے میں کچھ اور بتا سکتا ہے؟

شاعر: کس قسم کی؟ جناب! وہ تو ایک نفیس اور نازک عورت ہے۔ اس کا رنگ ہلکا گلابی ہے اور کچھ سنہرا بھی۔ دیکھتے وقت اس کی آنکھیں گول ہو جاتی ہیں لیکن عموماً نیم وا دکھائی دیتی ہیں۔ وہ جب آتی ہے تو بہار سی آجاتی ہے اور جاتے وقت قیامت برپا کر جاتی ہے۔ اس محل سے دو میل دور دریا کے کنارے ایک بڑی جگہ پر میری اس سے ملاقات ہوئی۔

سالار: عالی جاہ! یہ وہی جگہ تو ہے جس کی تلاش میں ہم خاصے پریشان رہے ہیں۔ یہ عورت وہی غدار شہزادی ہے جو نواب کے ساتھ سازش میں شریک ہے۔

شاعر: عالم پناہ۔ میرے ناقص بیان پر کوئی فیصلہ نہ کیجئے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا ہے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک معصوم عورت ہے۔

بادشاہ: اس شخص کو آزمایا جائے۔

سالار: اگر تجھے یقین ہے تو شاہی گاڑی میں ظلِ سبحانی کی بجائے تجھے بٹھا کر عبادت گاہ کی طرف لے جایا جائے کیا تجھے یہ شرط منظور ہے؟

شاعر: ہاں مجھے منظور ہے۔ وہ کبھی مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔

بادشاہ: ایسا ہے تو پھر دیر کس بات کی؟ فوراً انتظام کیا جائے۔

سالار: بجا ارشاد۔ (وقفہ)

(سالار تالی بجا کر ماتحت عملے کو حکم دیتا ہے) شاہی سواری کو فوراً خاص محل کے دروازے پر لایا جائے (دور سے گھوڑوں کے ہنکارنے کی آواز۔ رفتہ رفتہ گاڑی دروازے پر آتی ہے)

سالار: (شاعر سے) تم اس گاڑی میں بیٹھ جاؤ (وقفہ) ٹھیک ہے!

(بلند آواز میں) سپاہیو! بادشاہ سلامت کی سواری عبادت گاہ کی طرف روانہ ہو۔

(گھوڑوں کے ہنکارنے اور گاڑی کے جانے کی آواز)

بادشاہ: (بڑبڑاتے ہوئے) بزدل!.... غدار... (قدرے بلند لہجے میں) سالار! تمہاری وفاداری ہمیشہ یاد رہے گی۔

سالار: حضور کا سایہ ہمارے سروں پر تاابد قائم رہے۔ اجازت ہو تو اس کمرے میں تیز روشنی کر دی جائے۔

بادشاہ: اجازت ہے۔

(موسیقی کے ساتھ گاڑی کے چلنے کی آواز اور کئی آدمیوں کی ملی جلی آوازیں)

کلیپٹن: (آہستہ سے) گاڑی آگئی (آدمیوں کی سرگوشیوں اور گاڑی کے دوڑنے کی آواز) آخر موت نے تجھے ہمارے ہتھے چڑھا دیا۔ اے ظالم بادشاہ! تیری سزا یہی ہے....

(گولی چلنے کی آواز اور شاعر کی آہ ایک ساتھ ابھرتی ہیں اور شروع ہی سے پُراسرار موسیقی میں تبدیل ہو جاتی ہیں)

شاعر: (خوفناک آواز میں) اوہو.... ہا.... گولی شاید نکل گئی.... میں.... میں بچ گیا۔ مکار عورت! میں تجھ کو تیرے فریب کی سزا دوں گا۔ اتر کر بھاگتا ہے اور چکرا کر گر پڑتا ہے۔ ارے یہ کیا؟ (دردناک لہجے میں) یہ خواب ہے یا حقیقت؟

اُف! میں کیا کروں؟ ..... کہاں جاؤں؟ یہ تو وہی جگہ ہے۔ یہیں وہ چوراہا ہے۔ اس راستے میں بھی خطرے ہیں۔ اب مجھے شمال کی طرف جانے والی رہگذر پہ چلنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ میری منزل اُس طرف ہو۔

(پُراسرار موسیقی۔ پس منظر میں ناچ کی تیز لے ابھرتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد تالیاں بجتی ہیں)

شاعر: (تالیوں کی آواز میں) واہ وا کمال کا ناچ ہے۔ میں اس باکمال رقاصہ کو ضرور مبارکباد دوں گا۔

(وقفہ جس میں مختلف تماشائیوں کی آوازیں ابھرتی ہیں)

شاعر: (خوشگوار لہجے میں) واہ۔ وا۔ تمھارا فن تو لاجواب ہے

عورت: تم کون ہو؟

شاعر: اوہ۔ تم

عورت: کیا مطلب؟

شاعر: (غصے میں) تُو مکار اور فریبی ہے۔ تو نے مجھ کو فریب دے کر موت کی بستی میں جھونک دیا۔ یہ میری خوش نصیبی کہ میں بچ گیا۔

عورت: تم کون ہو؟ یہ کیا بک رہے ہو؟ نکل جاؤ یہاں سے نہیں تو تھیئٹر کے مینجر کو بلا کر تمہیں دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔

شاعر: تیرا اب کوئی بھی جادو مجھ پہ نہیں چلے گا۔ میں سب کو بتاؤں گا کہ تو وہ عورت ہے جس نے نواب سے مل کر بادشاہ کے قتل کی سازش کی تھی۔

عورت: یہ تم کس زمانے کی بات کہہ رہے ہو؟ کون بادشاہ؟ کیسا نواب؟ تم خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟

شاعر: خواب؟ کیا یہ سب کچھ خواب ہے؟

عورت: نہیں۔ نہیں یہ تو حقیقت ہے ہاں تم خواب کی باتیں کہہ رہے ہو۔

شاعر: خواب کی باتیں؟ ہا.....ہا... یہ تو حقیقت ہے۔ حقیقت۔ خواب اور حقیقت میں کتنا فرق ہے۔

عورت: معلوم ہوتا ہے تم بھی کوئی فنکار ہو۔

شاعر: ہا۔ ہا۔ ہا۔ میں فنکار ہوں ...... میں شاعر ہوں۔

عورت: (ٹھنڈی سانس بھر کے) فن کاروں کی دنیا بھی عجیب ہوتی ہے۔ خیالی دنیا جس میں فنکار اپنے آپ کو بھول جاتا ہے (قدرے جذباتی انداز میں) میں تو اس دنیا سے بیزار ہو گئی ہوں حقیقت سے دور رہ کر اپنے آپ کو کتنے فریب دینے پڑتے ہیں۔

شاعر: لیکن تم تو خوش قسمت ہو۔ تمہارے فن کی تو ہر ایک تعریف کرتا ہے۔ تمہیں تو زندگی کی سبھی خوشیاں حاصل ہیں۔ تمہارے پاس حُسن ہے۔ فن ہے پھر تمہیں کیا غم؟

عورت: (بیزار ہو کر) یہ سب فریب ہے۔ یہ سب کچھ دھوکا ہے۔ وہ ازلی و ابدی مسرت مجھ سے بہت دور ہے جس کو تلاش کرتے کرتے میں اس اسٹیج تک پہنچی ہوں۔ یہ زندگی ایک روگ ہے جس نے میری روح کو بھٹکا بھٹکا کر تھکا دیا ہے (بیقرار ہو کر) اتنے بڑے جہاں میں میرا کوئی بھی نہیں جو مجھ کو تسکین دے سکے۔ میں اس زندگی سے بیزار ہوں۔

شاعر: (بھرپور ہمدردی سے) میں تیرے لئے آسمان سے تارے توڑ لاؤں گا۔ میں ...... میں تیری خوشی کے لئے اپنی ہر تمنا قربان کر دوں گا۔

عورت: (بہت خوش ہو کر) کیا یہ سچ ہے؟

(موسیقی کی لہر جو وقت گذرنے کا تاثر پیدا کرتی ہے)

شاعر: میں بیحد خوش ہوں۔ بیحد خوش۔ مجھے وہی خوشی مل گئی جس کے لئے میں ساری زندگی بھٹکتا رہا کیا تم خوش نہیں ہو؟

عورت: اوں ...... ہوں۔ (ہنستی ہے)

شاعر: (نقل کرتے ہوئے) اوں ...... ہوں ...... یہ کیا؟ (رک کر) کچھ بتاؤ تو ......

عورت: ہاں ...... میں خوش ہوں۔ بیحد خوش۔ مگر تم مجھے میرے نام سے کیوں نہیں پکارتے؟

شاعر: دیکھو میں تمہیں اس نام سے نہیں پکاروں گا جو تمہارے گھر والوں نے رکھا ہے۔ میں تو تمہیں اپنے رکھے ہوئے نام سے بلاؤں گا۔ تمہیں خبر ہے کہ میں نے کیا نام رکھا ہے تمہارا؟

عورت: ہاں۔ ہاں مجھے بھی تو بتاؤ وہ کونسا نام ہے۔

شاعر: میں نے تمہارا نام 'چاندنی' رکھا ہے۔

عورت: (ہنستے ہوئے) چاندنی؟ بھلا یہ بھی کوئی نام ہے۔

شاعر: (سنجیدگی سے) یہ شاعرانہ نام ہے۔ تم واقعی چاندنی ہو چاندنی جس سے میرے دل کی دنیا سدا روشن رہے گی۔

عورت: (بیزار ہوکر) اوہو، تم پھر خیالوں کی دنیا میں چلے گئے۔

شاعر: آہ .... ایسا نہ کہو۔ ایسا نہ کہو۔ دیکھو تو موسم کتنا دلفریب ہے اور حسین ہے۔ آج تو میرا تن من ناچ رہا ہے۔

عورت: میں تمھیں کیسے سمجھاؤں۔ آخر تم خیالی دنیا سے کب باہر آؤ گے؟ مجھے ایسے احساسات و جذبات سے نفرت ہے جو حقیقت سے دور لے جائیں۔ میں کہتی ہوں تم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔

شاعر: میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ایسا کروں گا تو میرا ذہنی سکون ختم ہو جائے گا۔ اس انداز سے تو میں تخیل کے لعل و گہر حاصل کرتا ہوں۔ یہی تو میری زندگی ہے۔ تم مجھ سے میری زندگی کو کیوں برگشتہ کرنا چاہتی ہو؟

عورت: تم نے تو کہا تھا کہ "میری ہر خوشی کے لئے تم اپنی تمنائیں قربان کر دو گے۔ تم تو مجھ پر اپنا سب کچھ وار رہے تھے۔ میں نے تم پر اعتماد کر کے اپنی ناموری اور شہرت والی زندگی کو چھوڑ کر تمہارے دامن میں پناہ لی۔ اس لئے کہ مجھے وہ نعمت میسر ہوگی جس کے لئے میری روح بیقرار ہے۔

شاعر: یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں میں تو بس اتنا کہتا ہوں کہ میری ذہنی زندگی میں جمود نہ ہو۔

عورت: (سخت غصے میں) تم اس طرح نہیں سمجھو گے۔ میں نے اب تک بہت برداشت کیا اگر اب معاملہ سنگین ہو گیا ہے (پاگلوں کی طرح) میں تمہارا یہ سارا مان دان مٹا دوں گی۔ دیکھنا ابھی تمہاری شعر و شاعری کے دفتر کو آگ لگاتی ہوں (جاتی ہے)

شاعر: ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ میں سب کچھ برداشت کروں گا مگر اپنے خیالوں کو خاک ہوتا نہیں دیکھ سکتا

عورت: (کاغذوں کے ڈھیر کو پھاڑتے ہوئے) دیکھو آؤ دیکھو۔ میں ان کو آگ میں جھونک رہی ہوں۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تم میرا کچھ نہیں کر سکتے۔

شاعر: (چیختے ہوئے) یہ تم نے کیا کیا۔ (دفعتاً پستول پر نظر ڈالتے ہوئے) پستول! یہ پستول میرے پاس ہے۔ میں کہتا ہوں تم یہاں سے چلی جاؤ۔ (بدحواس ہو کر) نہیں تو .... نہیں تو اس پستول کی گولی تمہارے سر کے پرزے پرزے کر ڈالے گی۔

عورت: اچھا۔ تو چلاؤ گولی پھر دیر کیا ہے۔ ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔

شاعر: (پاگلوں کی طرح) جب ہی تمہیں موت کی پروا نہیں۔ ایسا ہے تو یونہی سہی۔ بس اب تم زندگی کا عذاب سہو میں اپنے آپ ہی کو ختم کر لوں گا۔

(پستول چلنے کی آواز اور ساتھ ہی دونوں کی چیخیں جو پراسرار موسیقی میں گم ہو جاتی ہیں)۔

شاعر: (غمگین لہجے میں) یہ کیا ہو گیا؟ کہاں گئی میری چاندنی؟ یہ تو اندھیری رات ہے اور .... اور .... یہ راہ؟ ارے یہ تو وہی چوراہا ہے جہاں سے میں کسی انجان دنیا کی طرف جانا چاہتا تھا۔ (خوفناک آوازیں) سب دھوکا ہے .... سب کچھ فریب ہے جھوٹا فریب۔ میں اس دنیا کی طرف نہیں جاؤں گا۔ ہرگز نہیں۔ میری دنیا زیادہ خوبصورت ہے۔ مجھے اب اپنی دنیا کی طرف لوٹنا چاہیے۔ میری اپنی دنیا حقیقی دنیا۔

(آخری الفاظ موسیقی میں فیڈ آؤٹ ہو جاتے ہیں)

مشہور امریکی افسانہ نگار او۔ ہنیری کی فینٹسی ROADS OF DESTINY سے متاثر ہو کر۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان حیدر آباد)